خطبات سید العلماء

فہرست مضامین خطبات متعلق کارنامۂ حسینی و مجاہدہ کربلا

از آیۃ اللہ العظمیٰ سرکار سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

پیش لفظ

کسی کتاب کے پیش لفظ یا تعارف کا معذرت کے الفاظ سے شروع کرنا شاید بہت مناسب نہ ہو لیکن کم سے کم اس موقع پر اس کا اظہار ضروری ہے کیونکہ مقدمہ نگار کو موضوع کی عظمت اور مصنف کی اعلیٰ علمی اور دینی شخصیت کا احساس اس شدت سے ہے کہ یہ دونوں باتیں اس کی جنبش قلم کے لئے زنجیر کا کام کرتی ہیں لیکن امتثال امر کے پردے میں عزت افزائی کا خیال اس معذرت پر غالب آنے کی جرأت پیدا کر رہا ہے۔ ایک بات اور، جو کم سوادی کے باوجود اظہار خیال میں محرک ہے وہ سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب کی تحریروں کا وہ پُرشوق مطالعہ ہے جس کا سلسلہ پچیس چھبیس برس کا قائم ہے۔ انہیں وجوہ سے یہ چند سطریں پیش لفظ کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ لیکن اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس پیش لفظ کو اس نظر سے نہیں پڑھنا چاہئے کہ اس سے کتاب کی محبوبیت یا قدر و قیمت میں کوئی اضافہ ہوگا بلکہ چند ایسے اشارے کر دینا مطلوب ہے جس سے مطالعہ کرنے والوں کی نظر موضوع کے پیچھے دریچے خارجی اور داخلی عوامل تک جا سکے اور اس بات کا احساس ہو سکے کہ مصنف نے کس خوبی سے انھیں اجاگر کیا ہے۔

زیر نظر کتاب جناب سید العلماء کے چند ایسے خطبات کا مجموعہ ہے جن کا موضوع واقعہ کربلا اور کارنامۂ حسینی ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے، خود مصنف علام نے اس کے مختلف پہلوؤں پر

سینکڑوں صفحات لکھے ہیں اور لاتعداد تقریروں میں اس مجاہدۂ عظیم کے اسرار و نکات بیان کئے ہیں لیکن تاریخ کے دامن پر وقت کی یہ ایسی خونابہ افشانی ہے جو انسانی ذہن کو برابر متوجہ اور متحرک کرتی رہتی ہے، اُس کے جذبات حریت اور درد مندی کو مسلسل اکساتی رہتی ہے کہ وہ تیرہ صدیوں تک اس تازہ رہ جانے والے خون کی نوعیت معلوم کرے۔ ہر دور کے مورخ، شاعر، مفکر اور خطیب اپنے شعور، ادراک، جذبات اور مصالح کے مطابق اس واقعۂ ہائلہ کے متعلق اظہار خیال کرتے رہے ہیں اس لئے اس کی تعبیریں اتنی مختلف رہی ہیں۔ زمان و مکان کی پہنائی میں چھوٹے بڑے واقعات اور تغیرات ایک دوسرے سے ٹکراتے اور زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے میں جڑتے چلے جاتے ہیں، حالات اور واقعات اسباب و علل سے وجود میں آتے ہیں اور پھر خود نئے اور کبھی کبھی دور رس نتائج کا سبب بن جاتے ہیں۔ مورخانہ صداقت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سبب اور نتیجے کے ان رشتوں کا پتہ لگائے اور بے کم و کاست اُن کو جوڑ کر پیش کر دے۔ لیکن مورخ بھی انسان ہوتا ہے، اپنے عقائد، تعصبات، ادراک حقیقت کے عقلی اور جذباتی ذرائع، طرز فکر اور مصالح رکھتا ہے اس لئے وہ واقعات کو جس طرح پیش کرتا ہے ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا شخص اسے اسی صورت میں تسلیم کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کی تعبیر میں تحقیق و تفتیش اور رد و قبول کی مختلف منزلیں آتی ہیں اور تاریخ میں اُن منزلوں کے تعین کے

سلسلہ میں مختلف مدارج قائم ہو جاتے ہیں۔ پھر انھیں منقولات
کے گرد و پیش معقولات اور جذبات کے دائرے بن جاتے ہیں جو قوی تر
محرک ثابت ہوتے ہیں۔

تاریخ اسلام کا ایک خاص منزلہ یہ حادثہ کربلا وقوع پذیر ہوا۔
مورخوں اور مصنفوں نے اپنی بصیرت، واقفیت اور اپنے نقطۂ نظر کے
مطابق اس کا ذکر کیا۔ جن ادوار اور جن تاریخی حالات میں یہ کتابیں
لکھی گئیں اُن میں بے لاگ تاریخ نویسی ممکن ہی نہ تھی اس لئے کہیں
اسباب و علل کی بحث غیر منطقی ہے اور کہیں اخذ نتائج کا طریقہ گمراہ کن۔
تاہم انھیں کے منتشر بیانات سے واقعات کی کڑیاں اس طرح جوڑی جا سکتی ہیں
کہ اس ابتلائے عظیم کا بہت سا حصہ اپنے اسباب اور نتائج کے ساتھ سمجھ
میں آ جاتا ہے۔ یہ دیکھنا بھی کہ اسباب کو سمجھنے اور اُن سے نتائج
نکالنے کی ذمہ داری مورخ کی ہوتی ہے، فرد یہ ممکن ہے کہ اسرار الٰہی
حقائق کے اصل اسباب اور واقعات کی بنیاد دریافتہ تک پہنچ جانا
اور اُن اسرار و رموز کے بھید کھول دینا جو عقیدے کی اصطلاح میں
بھی حقیقی کہے جا سکتے ہیں۔

مثلاً جب کوئی لکھنے والا یہ لکھتا ہے کہ امام حسینؑ نے ایسا اس
لئے کیا یا کیا کہ .... تو حقیقتاً اس کی تمام تر ذمہ داری
لکھنے والے پر ہوتی ہے، وہ امام حسینؑ کے قول اور عمل کو اپنے علم کے
آئینے میں دیکھتا اور اپنی محدود بصیرت کے مطابق اُن کی تشریح کرتا
ہے۔ اسے یہ کہنے یا سمجھنے کا حق نہیں ہے کہ جو کچھ سمجھ رہا ہے

وہی یقینی اور قطعی ہے جب تک کہ ایسا کہنے کے لئے اُس کے پاس وافر
مواد موجود نہ ہو۔ تاریخی واقعات نے جو مواد ہمارے لئے فراہم کیا
ہے اس کے تجزیہ یا اس کی چھان بین کے لئے بہت سے دوسرے علوم
کی ضرورت بھی ہوتی ہے مثلاً عمرانیات، نفسیات، فلسفہ، جغرافیہ،
سیاسیات، قانون، منطق، معاشیات، تاریخ مذاہب، فلسفۂ مذاہب
وغیرہ کی مدد سے حالات اور واقعات پر گہری نظر ڈالی جا سکتی ہے،
اور جب واقعۂ کربلا جیسا موضوع پیش نظر ہو تو اس میں قرآنی علوم،
احادیث، فقہ اور اسی طرح تاریخ اسلام کا تفصیلی مطالعہ کو بھی شامل
کر لینا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ ان تمام علوم اور حقائق پر نظر رکھنے کے
بعد بھی نتائج بالکل صحیح نہ نکلیں لیکن پھر ایک بڑے سے بڑے عالم
اور مفکر کے بس میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے
نتائج فکر کو علمی اور منطقی بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ان تمام
علوم اور حقائق کا جائزہ لے جن تک اس کی دسترس ہو۔

مولانا علی نقی صاحب کے یہ خطبات پڑھ کر یہی اندازہ ہوتا
ہے کہ انہوں نے کارنامۂ حسینی کو علم کے اسی وسیع آئینے میں دیکھا
ہے تاکہ اس کی آفاقیت اور اہمیت زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو سکے
اور اس کے وہ پہلو بھی پیش نگاہ ہو جائیں جن پر عام طور سے
توجہ نہیں کی جاتی۔ اس طریق کار میں اگر کوئی خطرہ ہو سکتا ہے
تو یہی کہ تعبیرات کے ہجوم میں واقعہ کی اصل روح دب نہ جائے

کے دور تجھے سنور گئے جن سے انسانیت کا نام روشن ہوتا ہے۔ مولانا
سید علی نقی صاحب نے واقعۂ کربلا کی عظمت اور کردار حسینی کے جلال و جمال
کو کسی وقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ مختصر خطبات
بڑے بلیغ انداز میں ان پہلوؤں کی طرف اشارے کرتے اور موضوع کی
وسعت سے روشناس کر دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مولف کی دوسری
تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی شوق سے پڑھی جائے گی کیونکہ توجہ سے پڑھے
جانے پر اس کا جوہر کھلتا ہے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے جملوں، فقروں اور بعض
اوقات لفظوں میں ایسی پُرکاری اور معنی خیزی ہے کہ سرسری مطالعہ کرنے
والے اس کے لفظی محاسن اور معنوی دقائق دونوں سے محروم رہ جائیں گے۔

سید احتشام حسین
لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ

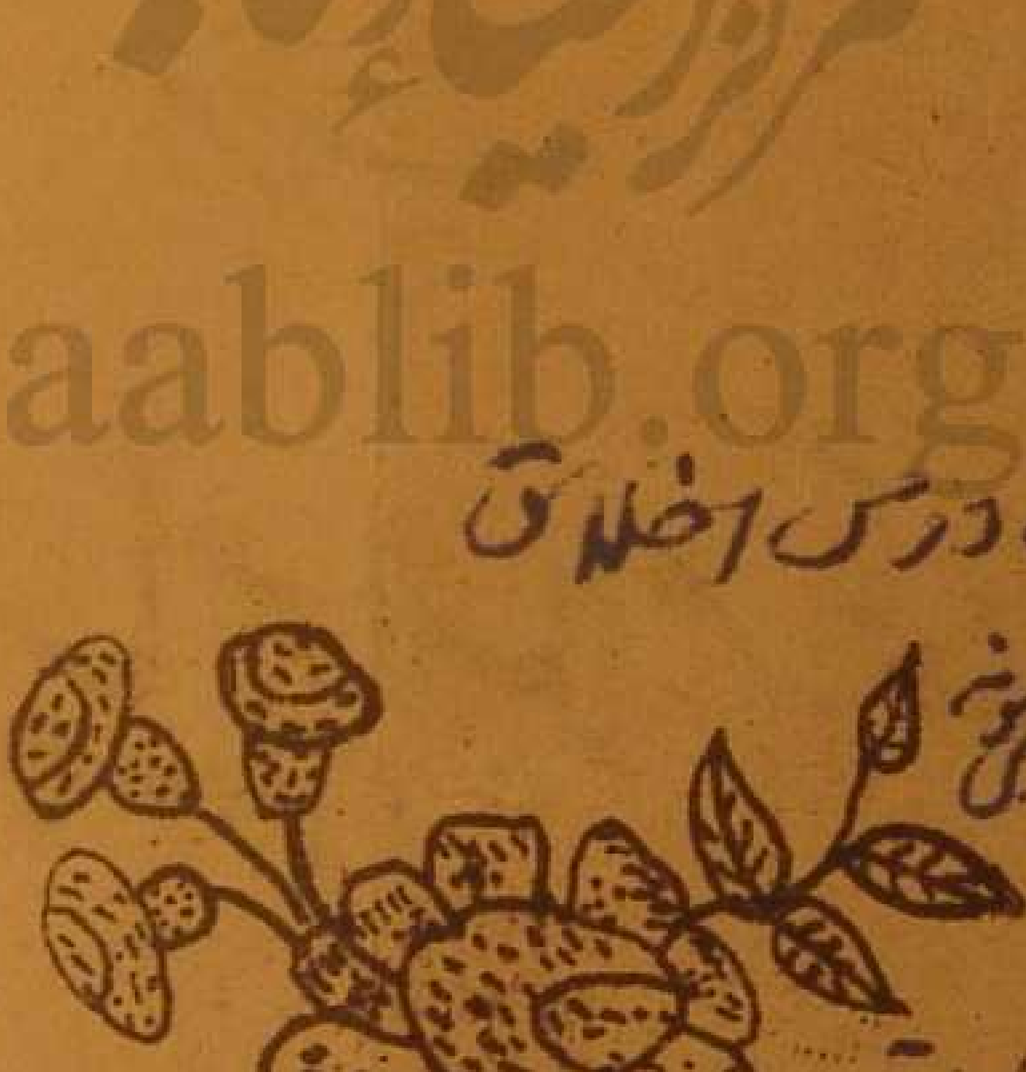
خطباتِ سیّد العلماء

متعلق کارنامۂ حسینی و مجاہدۂ کربلاء

مرتبہ

ادارۂ پیام اسلام۔ لکھنؤ

فہرست خطبات سید العلماءؒ



مقصدِ حسینؑ

وہ تقریر جو شب ہفتم محرم ۱۳۶۰ھ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی

پھولوں کی سیج پر آرام کی نیند سونا آسان ہے مگر کانٹوں پر بستر لگائے رکھنا مشکل۔ خوشی کو ہر ایک کی طبیعت ڈھونڈھتی ہے مگر غم کے ساتھ نباہ بہت دشوار۔ ہاتھ میں لگی ہوئی پھانس تو جب تک نکل نہ لے چین نہیں آتا۔ پھر دل میں چبھے ہوئے کانٹے کو سینہ سے لگائے رکھنا کہاں ممکن ہے۔ اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کربلا کا واقعہ بس ایک دردبھری کہانی نہیں تھا بلکہ اُس میں انسانی زندگی کے جراثیم مضمر تھے جب ہی انسانوں کی دنیا میں اُس کا چرچا ہوا، رہا اور پھیلتا رہا۔

اس وقت جبکہ ہم حسینؑ کے مقصد کو سمجھنے اور سمجھانے کھڑے ہوئے ہیں دنیا کے بہت سے حصوں میں حسینؑ کا غم منایا جارہا ہے اور ۶۱ھ میں کربلا کی سرزمین پر جو قربانی دی گئی ہے اُسے آج بارہ سو نناوے برس ہو چکے ہیں اور ایک برس کے بعد ۱۳۶۱ھ کا محرم آئے گا جس میں پورے تیرہ سو برس ہو جائیں گے اور اس لیے اس موقع پر دنیا کے اکثر حصوں میں ایک بہت بڑی یادگار منانے کا انتظام ہو رہا ہے۔

اس تیرہ سو برس کی لمبی مدت میں زمانہ نے کتنی کروٹیں لیں۔ آندھیاں چلیں اور نکل گئیں، سیلاب آئے اور گزر گئے مگر حسینؑ کی یاد زندہ رہی اور آج بھی زندہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کے نام اور اُن کے کام نے نوعِ انسانی کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ لب پر حسینؑ کا نام۔ دل میں حسینؑ کی یاد اور دماغ کو حسینی مقصد کی تلاش ہے۔ شخصی اور ذاتی مقصد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ زندگی اُس کی یاد میں صرف کرے۔ کسی مصیبت کے ستائے کو دیکھ کر نگاہ مڑجانا یا دل میں ہمدردی سے کسک پیدا ہونا بالکل ایک وقتی چیز ہے مگر اسے کوئی مستقل حیثیت نہیں مل سکتی حسینؑ کا مقصد نوعِ انسانی سے وابستہ تھا اور اجتماعی حیثیت رکھتا تھا اس لیے انسانیت نے اپنا دل چیر کر اُس کی یاد کو محفوظ کر لیا۔

اب آپ چاہتے ہوں گے کہ میں اُس مقصد کو کھلے لفظوں میں بیان کر دوں۔ اچھا سنیے! مگر آپ کو میرے ساتھ تھوڑی دور تک چلنا پڑے گا۔

آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے تمدن اور معاشرت اور آئین زندگی میں ایک انقلاب کا پیغام پہونچایا جس کا نام تھا اسلام۔ اسلام نے زندگی کے ہر حصہ میں بہت اہم تبدیلیاں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نوعِ انسانی کو برادری اور برابری کا سبق پڑھایا۔ وہ حدود و امتیازات جو انسانوں میں قائم ہو گئے تھے جن سے خدا کی مخلوق اونچے اور نیچے کے دو درجوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اُن تمام امتیازات پر اسلام نے قلم پھیر دیا اور تمام آدمیوں کو ایک اکیلے خدا کی پرستش کی دعوت دی۔

کون نہیں جانتا کہ دنیا میں "طاقت حق ہے" کا کلمہ ہمیشہ پڑھا گیا اور انتہا ہے کہ آج جبکہ دنیا تمدن اور تہذیب میں بڑے اونچے درجہ پر بتلائی جاتی ہے، آج بھی طاقت ہی کا بول بالا ہو رہا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نوعِ انسانی کے پرخچے اُڑ رہے ہیں اور انسانیت کے دامن کی دھجیاں ہوامیں تتر بتر دکھائی دیتی ہیں۔

عرب میں شعوبیت یعنی قوم و نسل کے امتیاز کا خیال بڑا غالب تھا۔ وہ اپنے سامنے غیر عرب کو انتہائی ذلیل سمجھتے تھے

اور خود آپس میں قانونی احکام اور فوجداری کے قوانین و تعزیرات تک میں بڑے اور چھوٹے کا فرق قائم کر لیا تھا۔ بڑے آدمیوں کی جانیں بہت مہنگی تھیں اور چھوٹے آدمیوں کی سستی جانیں تول میں اُن کے برابر نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ اُن میں مال و دولت۔ قوم و قبیلہ کی کثرت۔ خاندانی جاہ و حشمت وہ چیزیں تھیں جو عزت کا معیار سمجھ لی گئی تھیں اور جو لوگ ان چیزوں سے محروم تھے اُن کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔

یہ طاقت کی پوجا ہزاروں طرح کے اجتماعی گناہوں کی بنیاد تھی اور بہت سی خرابیوں کے سوتے اسی ایک سرچشمہ سے پھوٹ رہے تھے۔

حضرت محمد مصطفےٰ نے اگر پہلی ہی دفعہ ان حدود اور امتیازات کو ختم کیا اور برائی کا ایک نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ آدمی سب ایک ہیں، فرق ہے تو انسانی فرائض کے ادا کرنے کے ساتھ، جو ان فرائض کو سب سے زیادہ ادا کرتا ہے وہی سب سے بڑا آدمی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس سے تمام اُن لوگوں کے اقتدار کو کاری ضرب لگی جو عزت و اقتدار کے بٹوارے میں پہلے کافی حصہ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ڈٹ کر اسلام کا مقابلہ کیا اور پیغمبر کو ان کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ اس سلسلہ میں بدر، احد اور خندق کی لڑائیاں مشہور ہیں اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان لڑائیوں میں رسول کے مقابلہ میں قبیلہ بنی اُمیہ کا لیڈر ابوسفیان آگے آگے تھا۔ پیغمبر کو فتح ہوئی اور یہ لوگ ناکام ہوئے آخر میں ان کو ہتھیار ڈال دینا پڑے اور حضرت محمد مصطفےٰ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔

پیغمبر کے زمانہ میں کسی کو یہ موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اسلام کے اصول میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ آپ اپنے مشن کے بڑی سختی کے ساتھ خود پابند بھی تھے اور دوسروں کو پابند بناتے بھی تھے۔ اُس وقت جب عرب کے تمام قبیلوں کی طرف سے روپیہ کھنچ کھنچ کر آپ کے پاس آتا تھا اور ہزاروں آدمی آپ کا حکم ماننا اپنا فخر سمجھتے تھے اُس وقت بھی آپ نے فقیروں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، پرانے کپڑے پہننا اور ملنے والوں سے برابری کا برتاؤ کرنا نہیں چھوڑا۔ آپ نے اپنی مسجد کا مؤذن ایک حبشی کو بنایا تھا جسے عرب لوگ بہت ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر رسول نے اس کو بڑی عزت دے رکھی تھی۔ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک آزاد کیے ہوئے غلام کے ساتھ کر دی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپ نے اُسی غلام کے لڑکے کو بڑے اونچے خاندان والے عربوں کا سردار بنا دیا۔ اس پر لوگ بہت جزبز ہوئے مگر آپ نے ایک نہ سُنی اور اپنی بات پر قائم رہے۔ جن لوگوں کی آپ بڑی تعریف کرتے تھے اور انتہائی عزت کرتے تھے بہت سے اُن میں سے غریب، کمزور اور پردیسی لوگ تھے سلمان فارسی جو ایران کے رہنے والے تھے رسول کے ساتھ اتنی خصوصیت رکھتے تھے جو کسی دوسرے کو مشکل سے حاصل تھی۔ یہ سب اس لیے تھا کہ ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو اور انسانیت، سونے چاندی کے گنگا جمنی طوق اور زنجیروں کی قید سے آزاد ہو۔

افسوس کہ پیغمبر کی زندگی نے زیادہ ساتھ نہیں دیا اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کا مشن اس حیثیت سے مکمل ہو گیا تھا کہ آپ نے اُس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور کچھ لوگ عملی طور سے اُس کے پابند ہو گئے مگر آپ کو معلوم ہے کہ جمہور کی ذہنیت کی تبدیلی اور اُس تبدیلی کے راسخ ہونے کے لیے بہت بڑی مدت درکار ہوتی ہے۔

رسول کے بعد ابھی تھوڑے دن گزرے تھے کہ بنی اُمیہ کے اقتدار کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ شروع شروع صرف ایک صوبہ کے گورنر کی حیثیت سے تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اُس کے اثر اور نفوذ میں ترقی ہوتی گئی۔

شام میں اس خاندان کا اقتدار بالواسطہ اُس جماعت کا اقتدار تھا جو ہمیشہ پیغمبر اسلام سے لڑتی رہی تھی اور

آخر میں بے بسی سے سر اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئی تھی۔

اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس جماعت کے منصوبے اپنے بر سر اقتدار آنے کے بعد کیا ہونا چاہئیں؟
معمولی دل و دماغ بھی سمجھے گا کہ اُن ہی امتیازات کو واپس لانا جنھیں پیغمبر اسلام نے مٹا دیا تھا اور جن کا اثر اس جماعت
کے اقتدار پر بہت گہرا پڑا تھا۔ مگر چونکہ اس جماعت کا اقتدار اب اسلام کے سایہ میں، اسلام کی نمایندگی میں حاصل
ہوا تھا اس لیے ضرورت تھی کہ یہ اس پردہ ہی میں اپنے منصوبوں کی تکمیل کریں اور یہ اس سے زیادہ خطرناک تھا کہ یہ
کھل کر ایک دشمن کی حیثیت سے اپنے مقاصد کا اعلان کر دیتے۔

سمجھنے والوں نے سمجھا کہ اسلام کی سادگی اور اسلام کی مساوات کے بجائے ملوکیت اور جہانبانی کی شان پیدا ہو رہی
ہے اور سرمایہ داری کی بنیاد پڑ رہی ہے، اس پر احتجاج بھی ہوا اور احتجاج کا نتیجہ تھا ابوذر غفاری کا جلا وطن کیا
جانا، ربذہ کے جنگل میں بھیجا جانا اور رسول کے اس صحابی کا اکیلے دم توڑنا اور دنیا سے گزر جانا۔ یہ ابتدا ہے اُس
جنگ کی جس کی تکمیل کربلا میں ہوئی۔

زمانہ نے ایک کروٹ ایسی بدلی کہ اسلام کی شہنشاہی حضرت علیؑ کو حاصل ہوئی آپ کو سیاسی اقتدار حاصل ہونا
اُس سادگی اور مساوات کے اصول کی نئے سرے سے عملداری ہو جانا تھی جو رسول اسلام نے قائم کیا تھا، اسی لیے
مخالف جماعت نے بغاوت کی اور تابڑ توڑ کی شورشوں اور لڑائیوں میں آپ کو ایسا اُلجھایا گیا کہ آپ اُن مقاصد کو پورا
نہ کر سکے جو آپ کے سامنے تھے۔ آخر مسجد میں علیؑ کا سر تلوار سے دو ٹکڑے ہو گیا اور اسلامی مساوات کا وہ مشنری دنیا
سے رخصت ہو گیا۔

آپ کے بیٹے حضرت حسنؑ کو زمانہ وہ ملا جب شام کی حکومت کو بڑی قوت حاصل ہو چکی تھی، آپ نے جنگ کے
ذریعہ سے کامیابی کی کوئی صورت نہ پائی تو صلح کر کے مخالف کی جارحانہ کارروائیوں کو اصول کے شکنجہ میں قید کیا اور
آپ نے اپنی دور اندیشی سے کام لے کر یہ بڑی شرط رکھی کہ شام کے حاکم کو اپنے بعد کسی کے جانشین بنانے کا حق نہ ہوگا
بلکہ اس کے بعد حکومت بنی ہاشم کی طرف واپس آئے گی۔ یہ ایسی شرط تھی جس نے مستقبل کو کسی حد تک محفوظ کر دیا تھا مگر
سیاست کی دنیا میں سچائی اور وعدہ کی پابندی تو کوئی چیز ہے نہیں۔ وعدے کیے جاتے ہیں توڑنے کے لیے اور معاہدے
لکھے جاتے ہیں ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے لیے۔ وہی ہوا جو اس طرح کی سیاست کا تقاضا تھا۔ شرطیں کیسی اور کہاں
کا معاہدہ۔ حضرت امام حسنؑ کی زندگی آخری مقاصد میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ آپ کو پراسرار طریقہ پر زہر سے شہید کر دیا
گیا۔ یہ بھی ایک قربانی تھی جو اسلامی تمدن کی قربان گاہ پر نذر ہو گئی۔

اب اُن لوگوں میں جو اسلامی تمدن کے محافظ ہو سکتے تھے حضرت حسینؑ کی ذات باقی تھی۔ ظاہری طور پر اب آپ کو
قدم آگے بڑھانے کا کوئی موقع نہ تھا۔ وہ پورا مجمع جس کو ساتھ لے کر شام کی طاقت سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا امام حسنؑ
کی صلح کے بعد بکھر چکا تھا اور اب اُس کے اکٹھا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سیاست حاضرہ کی غیر اسلامی چالیں گھر گھر گھٹ رہی تھیں
اور آپ منتظر تھے کہ معاویہ اپنے بعد کے لیے کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

نہ سمجھنا چاہیے کہ اس مدت میں حق کے پجاری بالکل چپ رہے۔ نہیں اُس سخت اندھیری رات اور اُس کے سناٹے
میں بھی کبھی ادھر اُدھر سے چیخ کی آواز سنائی دیجاتی تھی مگر وہ آواز اسی طرح دبا دی جاتی تھی جس طرح آپ سنتے ہیں کہ ظالم اپنے
ملک میں ہر مخالف آواز کو دبا دیتا ہے۔ عمرو بن الحمق الخزاعی اور حجر بن عدی اور اُن کے دس گیارہ ساتھیوں کا انجام

تاریخ میں آپ کے سامنے ہے۔ یاد رکھیے کہ ان لوگوں کو حاکم شام سے کوئی خاندانی عداوت نہ تھی۔ وہ صرف اصول کا اختلاف تھا جس نے کائنات کی اس وسیع فضا میں ان کے لیے جگہ باقی نہ رکھی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان واقعات پر احتجاج ضرور کیا مگر پھر بھی آپ دیکھ رہے تھے کہ آخری شرط کا کیا انجام ہوتا ہے؟

پھر آگیا وہ وقت کہ امیر معاویہ نے اپنے بعد کے لیے اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنا دیا۔ یہ اُس مفاد کی آخری پامالی تھی جسے معاہدہ کے شرائط میں محفوظ کیا گیا تھا۔

یزید کے افعال بھی ایسے تھے جو اسلام کے احکام سے کھلم کھلا بغاوت کے مرادف تھے۔ امام حسینؑ نے اس کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

معاویہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ متعلق ہستی حسینؑ کی ہے۔ اس لیے اُنھوں نے کوشش کی کہ آپ کو ملا لیا جائے مگر یہ کوشش ناکامیاب ہوئی۔ امام حسینؑ نے صاف کہدیا کہ میں اس کارروائی سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ امیر معاویہ نے آپ کے ساتھ اس انکار پر زیادہ سختی نہیں کی مگر معاویہ کا انتقال ہو گیا اور یزید تخت حکومت پر بیٹھا تو اُس کے سامنے سب سے پہلے یہی مسئلہ تھا کہ حسینؑ سے بیعت حاصل کی جائے۔ اُس نے مدینہ کے گورنر کو لکھا کہ حسینؑ سے بیعت لو نہیں تو اُن کو قتل کر دو۔ یہ پہلا ہی تشدد کا قدم تھا جو حسین کے خلاف اُٹھایا۔ حسینؑ اُس کے لیے بالکل تیار تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ میری جان جائے مجھے گوارا ہے مگر میں اس سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا۔

وقت وہ تھا جب احساسات بالکل مر چکے تھے۔ فضا میں کامل سناٹا تھا۔ جن لوگوں سے مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا تھا اُن میں کچھ کا گلا گھونٹا جا چکا تھا اور کچھ کے ضمیر خرید کر اُن کی زبانوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ سنہری تلوار کی جھنکار اور روپیہ اشرفی کی کھنک نے بڑے بڑوں کے دل ڈانواڈول کر دیے تھے۔ اس وقت حسینؑ اُس آخری اقدام کے لیے تیار ہو رہے تھے جو بنی امیہ کے استبداد کے قصر کو زمین پر گرا دے۔

امام حسینؑ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے۔ اُنھوں نے جنگ کا ایک نیا طریقہ نکالا جو اس سے پہلے دُنیا نے نہیں دیکھا تھا۔ وہی اُن کے مقصد کے لیے زیادہ مفید اور کارگر بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ اُن میں ذہنی جمود پیدا ہو گیا ہے۔ اُن کے احساسات پر غشی چھا گئی ہے۔ اُن میں یہ شعور باقی نہیں رہا کہ بنی اُمیہ کے افعال و اعمال اسلامی طریقہ کے خلاف ہیں۔ بڑا سبب اس کا اسلام کے نام کی وہ نقاب ہے جو ان کے چہروں پر پڑی ہوئی ہے۔ حسینؑ چاہتے تھے ایک ایسا شدید جھٹکا دیں کہ ان کے احساسات پھریری لے کر ہوش میں آجائیں۔ اور چہرہ کی یہ نقاب ہٹ جائے۔ اُس کے اصلی خط و خال سامنے آجائیں اور دُنیا دیکھ لے کہ اس ملوکانہ سیاست کے انتہائی قدم کہاں تک جا سکتے ہیں۔

اُنھوں نے اس کے لیے فوج اور لشکر جمع نہیں کیا۔ اُنھوں نے وہ عابد و زاہد اور متقی لوگ ڈھونڈھے جن میں کا ہر شخص اپنے اخلاق و اوصاف کی بلندی سے سچے اسلام کا نمائندہ تھا اور ملک میں جس کے زہد اور پارسائی کا ہر شخص کو اعتراف تھا۔ اُنھوں نے رسول کے خاندان کے جوان اور بچے، یہاں تک کہ دودھ پیتا بچہ تک اپنے ساتھ لے لیا اور رسول کے گھرانے کی معزز عورتیں جن میں خاص رسول اللہؐ کی حقیقی نواسیاں موجود تھیں اپنے ہمراہ لیں۔ حسینؑ نے اپنے دشمن کی فطرت کو خوب پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے تشدد کے امکانات میں اضافہ کر رہے تھے۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے جو سامان اپنے ساتھ

لیا تھا وہ سب حسینی مقصد کی تکمیل میں صرف ہوا۔

بوڑھے قتل ہو گئے۔ جوان قتل ہو گئے بچے قتل ہو گئے۔ دشمن کے تشدد کا آخری تیر باقی تھا حسینؑ نے اُس کے لیے بھی نشانہ ڈھونڈھ دیا۔ رباب کی گود سے چھ مہینہ کا بچہ لے لیا۔ سب سے آخر میں اپنی گردن کو بھی پیش کر دیا۔ شاہزادیوں کو قید ہونے کے لیے اپنے بعد چھوڑا۔

یہ سب ہوا اور سمجھ بوجھ کر ہوا۔ حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور یزیدیت اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ حسینؑ کا مقصد بھی بس یہی تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن پر جو اموی شہنشاہیت کا رنگ چڑھ رہا ہے جس سے اُس کے حدود و امتیازات مٹتے جاتے ہیں، یہ رنگ اُتر جائے۔ دُنیا یہ سمجھ لے کہ اسلامی تمدن وہ نہیں ہے جو دمشق کے دار الامارہ میں نظر آتا ہے، جہاں شراب کے جام چل رہے ہیں اور مہوشوں کا جھرمٹ لگا ہے۔ جہاں تمام رعایا سے لے کر دولت سمیٹی جاتی ہے اور وہ خلیفہ کی رنگ رلیوں پر صرف ہوتی ہے۔ جہاں طرب و نشاط کے نقار خانہ میں غریبوں کی صدا سنی نہیں جاتی اور جہاں انصاف کو کند چھری سے حلال کیا جاتا ہے حسینؑ نے دکھلایا کہ اسلام کا تمدن وہ ہے جسے کربلا کے میدان میں پیش کر دیا گیا، جہاں ایک حبشی غلام بھی زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتا ہے اور امام کو آواز دیتا ہے تو امام اُس کے سرہانے جاتے ہیں اور سر اُٹھا کر گود میں رکھتے ہیں۔ غلام کی روح آقا کی گود میں جسم سے مفارقت کرتی ہے۔

یزیدی طاقتیں دنیا میں بہت پیدا ہو سکتی ہیں اور ہر قوم میں پیدا ہوتی ہیں، مگر حسینی مشن جو کربلا کی زمین پر پایۂ تکمیل کو پہونچا وہ ہر زمانہ میں یزیدیت کی شکست کے لیے کافی ہے، اس شرط سے کہ حسینؑ کے کارنامہ کو دنیا یاد رکھے اور اُس سے سبق حاصل کرے

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ

تقریر ریڈیو کے لیے شب ہم محرم ۱۳۶۴ھ

(کمی وقت کی وجہ سے اُس کا خلاصہ نشر ہوا پوری تقریر نشر نہیں ہو سکی)

بے شک حسینؑ شاہ تھے اور بادشاہ بھی تھے مگر وہ دنیوی بادشاہ نہ تھے۔ نہ اس بادشاہت کے کبھی طالب ہوئے، نہ اُنھوں نے اس بادشاہت کے لیے جنگ کی۔

"دنیوی بادشاہ" وہ ہوتا ہے جو تاج و تخت رکھتا ہو جو حشم و خدم کا مالک ہو جس کے گرد لاؤ لشکر جمع رہتا ہو مگر حسینؑ تو اُس نانا کے نواسے تھے جو دو دو وقت بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے پھرا کرتا تھا۔ جس کے گھر سے کئی کئی دن دھواں نہ اُٹھتا تھا۔ اُس ماں کے بیٹے تھے جو اپنے گھر میں چکی پیستی تھی۔ چرخہ چلاتی تھی اور جھاڑو دیتی تھی۔ اُس باپ کے بیٹے تھے جو باغوں میں جا کر مزدوری کرتا تھا اور محنت و مشقت سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔

ان کے نانا رسولؐ اللہ کا قدرتی جاہ و جلال گو اتنا تھا کہ سلاطین روم و فارس کے درباروں کے دیکھنے والے کہتے تھے کہ وہاں وہ رعب و داب نہیں جو یہاں نظر آتا ہے مگر اُنھوں نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا پسند نہ کیا۔ اُن کے سامنے جب ایک عرب آیا اور ہیبت سے تھرانے لگا تو اُنھوں نے کہا سنبھل جا سنبھل جا، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو عرب کی

ایک غریب عورت کا فرزند ہوں جو بہت معمولی غذا کھاتی تھی۔

ان کی مقدس ماں حضرت فاطمہ زہرا جو پیغمبر اسلام کی اکلوتی بیٹی تھیں گو اتنی سخی اور فیاض تھیں کہ گھر پر سے کسی سائل کو کبھی محروم واپس نہیں کیا مگر اپنے مقدس باپ کی فقیرانہ سیرت کی ایسی پیرو تھیں کہ دروازہ پر ایک بوسیدہ پردہ کے سوا کبھی دوسرا پردہ نظر نہ آیا۔ عرصہ تک تو گھر کے کاروبار کے لیے کوئی کنیز یا خادمہ تھی ہی نہیں۔ جب ایک کنیز جس کا نام فضہ تھا پیغمبر نے گھر کے کام کاج کے لیے عطا کی تو یہ ہدایت کر دی کہ ایک دن گھر کا کام تم کرنا ایک دن فضہ سے لینا حضرت فاطمہؑ نے ہمیشہ اسی پر عمل رکھا۔

حسینؑ کے بلند مرتبہ باپ حضرت علی مرتضیٰ گو اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار سب سے بڑے فاتح پیغمبر کے وزیر اور مسلمانوں کے سردار تھے جنھیں رسول نے خود امیر المومنین کا خطاب دیا تھا اور جنھیں آج تک بچہ بچہ جناب امیر کے نام سے یاد کرتا ہے مگر اس امارت کے باوجود غربت کی زندگی بسر کرتے تھے ایسی کہ بھوسی ملا ہوا جو کا آٹا غذا میں کھاتے تھے اور پیوند دار لباس پہنتے تھے ایسے نانا کی گود میں پل کر ایسی ماں کی پرورش اُٹھا کر اور ایسے باپ کے تعلیمات حاصل کر کے اپنی خداساز بلند فطرت کے ساتھ ساتھ حسینؑ کا مزاج بھی فقیرانہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ گو سخاوت جلالت وجاہت اور شان اُن میں موروثی تھی مگر شاہانہ غرور و تمکنت، شاہانہ جاہ و حشمت، شاہانہ طنطنہ و طمطراق اور سب سے زیادہ شاہانہ فریب سیاست سے اُن کو دلی نفرت تھی۔ اور اسی بنا پر وہ بادشاہ تھے نہ اپنے کو بادشاہ سمجھتے تھے نہ دوسروں کی زبان سے بادشاہ کہے جانے کو پسند کرتے تھے۔

وہ امر بادشاہت کے کبھی طالب نہیں ہوئے اُس وقت جب حضرت امام حسنؑ نے معاویہ سے مصالحت کر کے تخت سلطنت اُن کے سپرد کر دیا تو بہت سے آدمی اچھے اچھے ممتاز درجہ کے لوگ حضرت امام حسینؑ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کھڑے ہو جئے ہم آپ کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کے دل میں سلطنت کی کوئی خواہش ہوتی تو یہ بہت اچھا موقع تھا مگر آپ نے انکار کیا پھر اُس وقت کہ جب حضرت امام حسن کی وفات ہو گئی تو لوگ پھر حضرت امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا کہ اب کھڑے ہو جائیے۔ حضرت نے پھر بھی انکار کیا اور برابر خاموشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اُس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ دنیاوی سلطنت کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔

آپ نے اس بادشاہت کے لیے جنگ بھی نہیں کی۔ جب آپ اُس کے طالب ہی نہیں تھے تو اُس کے لیے جنگ کیا کرتے؟ اس کے علاوہ یہ آپ کے قول اور عمل دونوں سے ظاہر ہے

اگر آپ بادشاہت کے لیے جنگ کرنا چاہتے تو اسی وقت جب آپ کو سابق امیر شام کی وفات اور یزید کے تخت سلطنت پر بیٹھنے کی اطلاع ہوئی ہے اور مدینہ کے حاکم نے آپ کو بیعت کے لیے طلب کیا ہے اُسی وقت حاکم مدینہ پر حملہ کر دیتے۔ مدینہ پر قبضہ کر لیتے اور پھر اپنی قوت میں اضافہ کر کے یزید سے برسر پیکار ہوتے۔ جبکہ عبد اللہ بن زبیر کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ حجاز و عراق ہی میں اپنی سلطنت قائم کر کے ایک کافی مدت تک حکومت شام سے لڑتے رہیں تو حسینؑ کے لیے ایسا کیوں نہیں ممکن تھا حالانکہ آپ مسلمانوں کے دلوں پر عبد اللہ بن زبیر سے زیادہ اقتدار رکھتے تھے اس کے بعد جب مکہ میں آپ پہونچے تاریخ بتلاتی ہے کہ اس وقت لوگوں نے عبد اللہ بن زبیر کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا اور امام حسینؑ کے گرد رہنے لگے مگر آپ نے کسی اقتدار کے حصول کے لیے اس جماعت کی مدد حاصل

کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اُس وقت جب کوفہ کے لوگوں نے مذہبی ہدایت کی غرض سے آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تو اُنھوں نے یہ لکھا کہ اگر آپ آئیے تو ہم حکومت شام کے گورنر کو نکال دیں اور تخت سلطنت پر قبضہ کرلیں مگر آپ نے اُن کو لکھا کہ امام کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کو نافذ کرے۔ فرائض ہدایت کو انجام دے اور تعلیمات خداوندی سے ایک سرمو انحراف نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے دار الحکومت یا تخت سلطنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے تو ہدایت خلق منظور ہے اور احکام خدا کی تبلیغ مدنظر ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ جناب مسلم بن عقیل جو حضرت کے نمائندہ ہو کر کوفہ گئے تو اُنھوں نے خاموشی کے ساتھ ایک دوست کے مکان پر قیام کرلیا اور کوئی کوشش اس بات کی نہیں کی کہ کوفہ کے حاکم کو کوفہ کے تخت سے ہٹادیں یا دار السلطنۃ پر قبضہ کرلیں۔

پھر جبکہ نہ وہ بادشاہ تھے۔ نہ بادشاہت کے کبھی طالب ہوے۔ نہ بادشاہت کے لیے اُنھوں نے جنگ کی تو اُنھیں شاہ اور بادشاہ کہنے کا کیا مطلب یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ شاہ معین الدین چشتی اجمیری نے اپنی رباعی میں یہ دو لفظیں ایک ساتھ نظم کی ہیں۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسینؑ　　دین است حسین دیں پناہ است حسینؑ

سرداد نداد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لاالہ است حسینؑ

تو کیا شاہ اور بادشاہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ دو لفظیں صرف ضرورت شاعری سے مصرع کو پورا کرنے کے لیے لائی گئی ہیں بہت سے لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں در حقیقت ایسا نہیں ہے

جناب خواجہ غریب نواز نے جن کا مزار اجمیر میں زیارت گاہ جمہور ہے حضرت شہید کربلا امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں جو عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے وہ کوئی معمولی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

یہ اور بات ہے کہ آج جب دنیا سطحی اور مادی علوم کی گرویدہ ہو کر حقیقت اور علم باطن سے کوسوں دور جا پڑی ہے تو وہ ان بزرگ افراد کی گہری باتوں کی تہوں تک نہ پہونچ کر اعتراض پر اُتر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ اور بادشاہ دونوں کے الگ الگ معنی ہیں اور دونوں کے ملنے سے شہید کربلا کی شخصیت اور آپ کے بلند کردار پر جو تیز روشنی پڑتی ہے وہ کبھی ان میں سے ایک لفظ سے نہیں پڑسکتی تھی۔

غور کیجیے تو انسان آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش پر جب نظر ڈالتا ہے تو ہر طرف مادی اجسام، مادی حالات اور مادی عناصر کی ترکیب یافتہ شکلیں اُس کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ وہ محبت کرنا چاہتا ہے تو مادی اسباب کے قائم کردہ رشتے اُس کی محبت کو جذب کرلیتے ہیں بچپنے میں ماں باپ بھائی سے روشناس ہوا اور اُن کی محبت دل میں بیٹھی۔ جوان ہوا تو جذبات کی رو میں بہہ کر بہت سے بیگانوں سے اُلفت کرنے لگا کبھی شخصی اغراض اور انعام و عطا کی لالچ میں کسی کا گرویدہ ہو گیا۔ اس وقت دنیا اپنی تمام دل فریبیوں کے ساتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اور وہ اس کائنات کے جمالی میں کھو جاتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے تو مادی نگاہ سے، سنتا ہے تو مادیت کے کانوں سے، کامیابی سمجھتا ہے تو اسی دنیا کے ظاہری

اقتدار کو محبت کرتا ہے تو وقتی فائدوں اور سامنے کی ذرا خوشی کو دیکھ کر اور نفرت کرتا ہے تو اسی دنیا کے نقصانات اور ناگوار خاطر باتوں کے احساس سے۔

خواہش پروری اور اقتدار پسندی اور پھر آخر میں دہریت، الحاد اور مادہ پرستی سب اسی پہلی نگاہ میں حجاب ہو جانے کے مختلف درجے ہیں۔

اس صورت میں بادشاہت اگر ہوگی تو وہ نام ہوگا کمزوروں کو غلام بنانے کا، فقیروں کو اپنا بندہ بے دام قرار دینے کا اور دوسروں کا خون چوس کر اپنا پیٹ بھرنے کا، حیلہ مکر و فریب جس طرح سے اپنا کام نکالے گا جس کو کہا جاتا ہے ملوکانہ سیاست۔

یہی وہ سلطنت تھی جس سے محمد و آل محمد ہمیشہ الگ رہے، نہ وہ بادشاہ رہے نہ اس بادشاہت کے طالب ہوئے نہ اُس کے لیے کبھی جنگ کی۔

مگر دوسرا درجہ انسان کی نظر و فکر کا یہ ہے کہ وہ جمال صنعت کو دیکھ کر صناع کی طرف متوجہ ہو، وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات پر غور کرے اُس بلند طاقت کی جانب مڑ جائے جو ان تمام کائنات کی پیدا کرنے والی اور ان سب کے باقی رکھنے اور تربیت کرنے کی کفیل ہے۔

جب انسان دل کی آنکھوں کو کھول کر اُس طرف نظر ڈالے گا تو ما فوق امکان تجلیاں نظروں کے سامنے کوندنے لگیں گی وہ جمال نظر آئے گا جس کے مثل کوئی جمال آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں۔ وہ عظمت محسوس ہوگی جس کے مثل کسی عظمت نے دل پر کبھی اثر نہیں ڈالا اس درجہ تک پہونچنے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر چیز سے آنکھ بند کر لے ہر شے سے رشتہ قطع کرے۔ نہ کوئی حسن اپنی طرف اُس کے دل کو مائل کر سکے۔ نہ کوئی خوف اُس کے دل کو مرعوب کر سکے۔ نہ کوئی دلکش مرقع اُس کی نظر کو اپنی طرف موڑ سکے نہ بیوی بچے، بھائی بہن عزیز اقارب کسی سے اُس کی دل بستگی ہو۔ وہ پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر غاروں کی تاریک گہرائیوں کے اندر جنگل کی وسیع فضا میں اُسی ایک مرکز حسن کی یاد میں مستغرق رہے کہ جس سے زیادہ حسین جلوہ اُسے کہیں نظر نہیں آ سکتا

جو اس درجہ پر پہونچ جائے اُس کو اہل سلوک کی عام اصطلاح میں ”شاہ“ کہتے ہیں۔ اسی میں رفتہ رفتہ انسان ترقی کرتا ہے تو محو ہو اور آخر میں فانی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ایک طبقہ ہے کہ جو اُسی کو انسانیت کی معراج تصور کرتا ہے مگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ درجہ انسانی زندگی کا آخری مقصد نہیں بن سکتا کیونکہ اس درجہ میں انسان کے اندر انفرادیت اور توحد یعنی تنہائی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ حالانکہ انسان فطری طور پر تمدنی زندگی کا حامل ہے۔ کسی شے کا نقطۂ کمال وہ نہیں ہو سکتا جو اُس کی اصلی فطرت کے ساتھ متضاد حیثیت رکھے بلکہ ایسا نقطۂ کمال وہ ہوگا کہ جس میں فطری خاصیت حکیمانہ تربیت کے ساتھ زیادہ مفید اور منظم شکل میں نمایاں ہو۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درجہ بھی ایک درمیانی منزل ہے جہاں رک جانا سالک کے حوصلہ کی پستی کا نتیجہ ہے وہ جمال مطلق کہ جہاں اس کی نگاہ جا کر جمی ہے اور اُس کے جلووں میں غرق ہو گئی ہے ایک الگ تھلگ ہستی نہیں ہے جس کا کچھ تعلق اس کائنات کے ساتھ نہ ہو بلکہ خالق، رازق، مربی اور اصل مرکز فیض اور سرچشمۂ وجود ہونے کی بنا پر اُسے اس کائنات کے ساتھ اور کائنات کا اُس کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ وہ اُس کی وسعت رحمت ہے جو ہر ہر فرد پر چھائی ہوئی ہے انسان اگر صحیح معنی میں کسی کے ساتھ محبت رکھتا ہے تو ہر اُس شے کے ساتھ محبت ہونا بھی ضروری ہے جسے

اُس محبوب کے ساتھ تعلق ہو اور ہر اُس مفاد کو عزیز رکھنا ضروری ہے جو اُس کے محبوب کو مدنظر ہو اور اس لیے اگر انسان حقیقی معنی میں عشق الٰہی کے درجہ تک پہونچا ہے تو وہ خلائق سے جدا ہو نہیں سکتا بلکہ اگر جذبۂ عشق نے محض وارفتہ نہیں بنا دیا ہے اور اُسے محبوب کی نگاہوں کا بھی خیال ہے اور اُس کی مرضی بھی منظور نظر ہے تو وہ اللہ تک پہونچنے کے بعد پھر ایک دفعہ واپس آئے گا اس خلق کی طرف مگر اپنی محبت کی آغوش کو اتنا کشادہ کر کے جو اللہ کی وسعت رحمت کے ساتھ سازگار ہو سکے اور اُن فرائض کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو احتیاط زندگی کے کامیاب بنانے کے لیے اُس کے خالق کو مطلوب ہیں اب اُسے اللہ عزاسمہ کے ساتھ وہ عشق بھی ہے جو ایک شاہ یعنی عارف کامل کو ہونا چاہیے اور خلق کے ساتھ وہ تعلق بھی ہے جو ایک بادشاہ کو اپنی رعایا کے ساتھ ہمہ گیر طور پر ہونا چاہیے۔ پہلی منزل میں یعنی مادہ پرستی کے دور میں اگر انسان کو دنیا والوں پر اقتدار حاصل ہو اور وہ جس کا نام ہے بادشاہت تو ہر وقت اپنے اقتدار کی گرفت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کرے گا اپنے اثر کو بڑھانے میں مصروف رہے گا۔ اپنے عزیزوں دوستوں اور خوشامد کرنے والوں کو ہر طرح کے فائدے پہونچانے کا مقصد پیش نظر رہے گا۔ اور کمزوروں کی آزادی کے سلب کرنے میں لذت محسوس کرے گا اور یہی کوشش رہے گی۔

کہ

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے   عمارت بناتے چلے جایئے

لیکن شاہی کی منزل تک پہونچ جانے کے بعد انسان کو عامۂ خلائق سے جو تعلق پیدا ہو گا اُس میں خلق خدا کی بہبودی ہر وقت پیش نظر رہے گی۔ کمزوروں کو مدد پہونچانا نقطۂ نگاہ رہے گا۔ گرتے ہوؤں کو سنبھالنے ڈوبتے ہوؤں کو نکالنے اور تباہ حال افراد کو بچانے کی کوشش ہوگی۔ یہاں اپنے اور پرائے کی تمیز نہ ہوگی۔ بلکہ اپنا سگا بھائی بھی حق سے زیادہ طلب کرے گا تو اُس کی بات رد کر دی جائے گی چاہے وہ اس پر خفا ہی کیوں نہ ہو جائے بلکہ آئین و قانون کے معاملہ میں بیٹوں تک کی مراعات پیش نظر نہ ہوگی۔ ہر وقت حق پروری اور فرض شناسی سے مطلب ہوگا۔ یہ ہوگی وہ بادشاہت جو شاہ ہونے کے ساتھ ہو اور ایسا ہی انسان حقیقی معنی میں سلطان عادل ہو سکتا ہے چاہے تاج و تخت نہ رکھتا ہو اور حشم و خدم اُس کے پاس موجود نہ ہو۔

آپ اگر پہلی قسم کے بادشاہوں کو ڈھونڈھنا چاہیں تو بہت سے نمرود، فرعون اور یزید اُس کی مثال پیش کرنے کے لیے آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے اور اگر ایسے شاہ ڈھونڈھنا چاہیں جو بادشاہ نہیں ہیں تو بہت سے درویش اور تارک الدنیا تاریخ کے اوراق پر اور شاید کہیں کہیں مشاہدہ میں بھی آپ کے سامنے آجائیں لیکن اگر آپ شاہ ہونے کے ساتھ بادشاہ ہونے کی مثال تلاش کیجئے تو آپ کو پیغمبر اسلام اور اُن کے حقیقی پیروؤں میں مل سکتی ہے اور اہلبیت رسول اس کا بہترین نمونہ ہیں اُن کی شاہی دیکھنا ہو تو محراب عبادت میں دیکھیے اور اُن کے الفاظ میں معرفت کے دریا بہتے ہوئے دیکھ کر اندازہ کیجئے اور بادشاہی دیکھنا ہو تو مجمع اصحاب میں دیکھ لیجئے۔ مسند قضا پر دیکھ لیجئے۔ یا غریبوں اور محتاجوں کی صدا پر اُن کے تڑپ جانے، ضرورت مندوں کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہونے اور ہر ایک کی ضرورت کو فوراً پورے کرنے کی کوشش بلکہ کبھی کبھی غریبوں کے گھر پر جا کر راتوں کے پردہ میں اس کی خبرگیری اور اعانت کے مناظر کو دیکھئے۔

حسینؑ اُن ہی پیغمبر اسلام کے نواسے تھے جنھوں نے خالق اور مخلوق کے رشتوں کے اس باہمی ارتباط کا دنیا کو سبق دیا ——

اُنھوں نے جن سخت اوقات میں اور کٹھن منزلوں پر شاہی اور بادشاہی کے حدود کو نباہا ہے اُس کی نظیر تاریخ انسانیت میں ناپید ہے ——

موقع نہیں کہ اُن کی سیرت زندگی کے واقعات سے مکمل طور پر اس کا ثبوت پیش کیا جائے مگر صرف کربلا کی سرزمین پر محرم کی دسویں تاریخ میں آپ نے جس جس طرح اس کا نمونہ پیش کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

عاشور کی تاریک رات جبکہ تباہی کی ڈراؤنی پرچھائیاں ہر سمت پھرتی نظر آتی تھیں۔ موت کا فرشتہ پر کھولے ہوئے فضا میں سایہ فگن تھا۔ اور اُمید سلامتی کے دھندے نقوش بھی رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے تھے بلکہ بالکل مٹ چکے تھے۔ کوئی دنیادار انسان ہوتا تو یہ رات عزیزوں سے دل بھر کر رخصت ہونے میں صرف کرتا۔ اپنے پسماندگان کو اپنے بعد کے لیے وصیتیں کرتا اور کم از کم تدابیر جنگ میں مشورے کرتا مگر حسینؑ کامل "شاہ" تھے اس لیے اُنھوں نے اپنا مصلےٰ بچھا دیا۔ اُن کے ساتھ والوں کے بھی مصلے بچھ گئے اور پوری رات صرف عبادت خدا میں گذاری۔

اسی کے ساتھ حسینؑ بادشاہ تھے اسی لیے اُنھیں یہ فکر بھی کہ اگر ساتھ والے ضمیر کی اجازت سے اپنی جانیں بچانا چاہیں تو میرے ساتھ اپنی جانیں کیوں دیں۔ اسی لیے اُنھوں نے عبادت خالق کی مصروفیت کے اندر اتنا وقت بھی نکالا کر ان سب کو جمع کر کے یہ اجازت دی کہ تم لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ اور اس پردۂ شب میں مجھ سے الگ ہو جاؤ کیونکہ دشمن کو تو میری جان سے مطلب ہے۔ تم سے سروکار نہیں ہے تم اپنی جان میرے سبب سے کیوں دو۔ اتنا ہی نہیں کہ اُنھوں نے عمومی طور پر یہ ایک تقریر فرما دی بلکہ خصوصی طور پر ایک ساتھی کے لیے جب یہ سُنا کہ اُن کا فرزند سرحد پر گرفتار ہو گیا ہے تو اُنھیں بلا کر کہا کہ تم خاص طور پر میری بیعت سے آزاد ہو جاؤ اور اپنے بیٹے کی رہائی کی فکر کرو۔ جب وہ کسی طرح ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو آپ نے ایک قیمتی لباس اُن کے حوالے کیا کہ اسے اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ بھیجو کہ وہ جا کر اسے فروخت کرے اور اپنے بھائی کو چھڑانے کا انتظام کرے۔

کیا کربلا کے ایسے ہولناک موقع پر اپنے ساتھیوں کے دُکھ درد اور تکلیف کا اتنا خیال کسی معمولی انسان کو ہو سکتا ہے روز عاشور کی قربانیوں میں بھی یہ دونوں باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں حسینؑ حق کی خاطر اپنے عزیز ترین دوستوں اور بھائیوں بھتیجوں اور بیٹوں کو خوشی خوشی تلواروں کے اندر بھیج رہے تھے کیونکہ وہ شاہ تھے۔ اللہ کی مرضی کے سامنے دُنیا کا کوئی رشتہ عزیز نہ تھا مگر ان کی جدائی پر روتے بھی تھے۔ اُن کا غم بھی کرتے تھے اور اُن کی لاشیں مقتل سے اُٹھا اُٹھا کر لاتے تھے اس لیے کہ وہ بادشاہ بھی تھے یعنی خلق کے ساتھ تعلق اور محبت رکھتے تھے۔

سب سے زیادہ سخت موقع وہ حسینؑ کی زندگی کا آخری وقت ہے جب وہ زخموں سے چور تھے۔ کربلا کی گرم زمین اور اُس وقت قاتل کا قریب آنا خنجر کا نیام سے نکلنا اور حسینؑ کا سجدۂ خالق میں پیشانی رکھے ہونا۔ دوپہر کی دھوپ سے جلتی ہوئی ریت۔ اور زخمی پیشانی۔ یہ شاہی کی بلند تصویر ہے قاتل سنتا ہے کہ حسینؑ کچھ کہہ رہے ہیں۔ کان قریب لے گیا تو ضعف سے بھرائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ گوش زد ہیں کہ خداوندا میں نے اپنے امکانی فرض کو پورا کیا۔ یہ تیرا کام ہے کہ تو میرے نانا کی اُمت کو عذاب سے نجات دے یہ تھا بادشاہی کا تقاضا جسے حسینؑ آخر وقت تک نباہ گئے۔ بالکل سچ ہے کہ

شاہ است حسین بادشاہ است حسین

نہ ایسی شاہی کہیں نظر آسکتی ہے اور نہ بادشاہی نظر آسکتی ہے واللہ کہ اسے حسینؑ کا رسے کر دی

دیں پناہ است حسینؑ

(سرکار سید العلماء مدظلہ کی وہ تقریر جو ۱۰ محرم ۱۳۶۶ھ کو ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

کوئی شک نہیں کہ اللہ کا دین جس کے انسانوں تک پہونچانے کی خاطر پیغمبر بھیجے گئے، کتابیں اتاری گئیں شریعتیں جاری کی گئیں، جس کی خاطر نوحؑ نے تکلیفیں اُٹھائیں۔ ابراہیمؑ نے سختیاں جھیلیں۔ موسیٰؑ نے مصیبتیں برداشت کیں اور عیسیٰؑ نے مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔ وہ دین الٰہی جس کے پہونچانے میں محمد عربیؐ نے صدمے سہے، زحمتیں گوارا کیں۔ دل پر زبان کے اور جسم پر پتھروں کے زخم کھائے۔ وہ۔ وہ دین جس کی حفاظت میں حمزہ کام آئے، عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلب نے جان دی، حمزہ کا جگر چاک ہوا، جعفر کے ہاتھ قلم ہوئے اور علیؑ عمر بھر جہاد کرتے رہے۔

اُس وقت چاروں طرف مددگار کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور بزبان حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا "ھل من ناصر ینصرنی"، کوئی مددگار ہے ایسا جو میری مدد کرے، جب ۶۰ھ میں دمشق کے تخت سلطنت پر یزید حکمران ہوا اور امام حسینؑ سے بیعت کا طلبگار ہوا۔

حسینؑ خوب سمجھتے تھے کہ مجھ سے بیعت طلب کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے۔ اگر صرف بحیثیت ملک عرب کے ایک باشندے یا نسل قریش کی ایک فرد کے بیعت طلب کی جا رہی ہوتی تو اس میں اتنی کد و کاوش کی ضرورت نہ تھی۔ جبکہ تمام ملک عرب اور حجاز کے کل باشندے یزید کی بیعت کر چکے تھے تو ایک حسینؑ نے اگر بیعت نہ بھی کی تھی تو اصول جمہوریت پر یزید کی سلطنت کا کیا بگڑتا تھا۔ ایک فرد اور وہ بھی تارک الدنیا۔ عزلت گزین اور گوشہ نشین۔ دنیا کے شور و شر سے الگ تھلگ ساکت اور ساکن۔

حسینؑ کا کوئی دوست نہیں دشمن بھی یہ نہیں بیان کر سکا کہ حسینؑ نے اپنے مدینہ کے قیام میں کبھی کوئی تقریر حکومت شام کے خلاف کی ہو۔ کبھی کوئی خط و کتابت کی کسی طرح کی بھی کوئی کوشش یزید کے مقابلہ پر کی ہو یا کسی صورت سے بھی ساکن فضا کو متحرک بنانا چاہا ہو۔ پھر صرف ایک منفی طرز عمل یعنی بیعت نہ کرنا یزید کو کیا نقصان پہونچا سکتا تھا جبکہ عرب میں کتنی ہی بڑی کانفرنسیں یزید کی بیعت لینے کے لیے ہوئی ہوں کتنے ہی بڑے پیمانہ پر اس تحریک کا سب کو پابند بنایا گیا ہو لیکن ہزاروں آدمی اس ملک کے گوشوں کے پھر بھی ایسے ہوں گے جن سے نہ یزید کی بیعت کا مطالبہ ہوا نہ انھوں نے بیعت کرنے کا کوئی مظاہرہ کیا۔

خود خاندان بنی ہاشم میں عبد اللہ بن جعفر بھی تو تھے۔ محمد بن حنفیہ بھی تو تھے۔ عمر بن علیؑ۔ عون بن علیؑ اور حسین بن علیؑ کے دوسرے بھائی بھی تو تھے۔ ان میں سے کسی ایک سے بیعت کا مطالبہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بس صرف حسینؑ وہ تھے جن سے یزید کی تمام کوششیں مرکوز ہو گئیں کہ آپ سے بیعت لی جائے۔

اسی سے صاف ظاہر تھا کہ حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ بحیثیت ملک عرب کے ایک شخص اور حجاز کے ایک رہنے والے اور قریش یا بنی ہاشم کی ایک فرد کی نہیں ہے بلکہ آپ سے بیعت کا مطالبہ اس خصوصیت کے لحاظ سے ہے کہ حسینؑ خاندان رسول کی عظمت کے نمائندے۔ علیؑ کے جانشین اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کے قائم مقام ہیں۔ حسینؑ سے بیعت لینے

کے معنی یہ تھے کہ یزید گویا بانیِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ کی بارگاہ سے اپنے افعال پر مہر تصدیق ثبت کرائے اور اس طرح دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرے کہ یزید کا رواج دادہ نظام معاشرت اور نظام حکومت حق ہے۔ اس لیے حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا حسینؑ نے اپنے موقع کی نزاکت محسوس کر لی۔

اُنھوں نے سمجھ لیا کہ میری بیعت کے معنی یہ ہیں کہ علیؑ نے بیعت کی اور میری بیعت کے معنی یہ ہیں کہ محمد مصطفیٰؐ نے اس نظام کو تسلیم کر لیا اور میری بیعت کے معنی یہ ہیں کہ حق باطل کے سامنے۔ سچ جھوٹ کے سامنے اور دین لادینی کے سامنے ہمیشہ کے لیے جھک گئے۔ حسینؑ جانتے تھے کہ بیعت نہ کرنے کا انجام کیا ہوگا مگر وہ جیسے محسوس کر رہے تھے کہ اس وقت دین اسلام کی نظر میرے چہرے پر ہے اور وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ میری حفاظت کی خاطر حسین کسی اشارہ قربانی پر تیار ہو سکتے ہیں یا نہیں حسینؑ جانتے تھے کہ یہ وہ دین ہے جو میرے مالک، میرے معبود اور میرے خالق کی امانت ہے اس لیے بحیثیت مخلوق بحیثیت عبد اور بحیثیت مملوک مجھے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ یہ میرے نانا محمد رسول اللہؐ کی تمام عمر کی مقبول زحمتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے اس لیے بحیثیت فرزند رسول ہونے کے مجھے اُس کی حمایت لازم ہے۔ اور اس دین کا استحکام میرے باپ علی مرتضیٰ کی تلوار کا ثمرہ ہے اس لیے بحیثیت علیؑ کے جانشین کے بھی مجھ ہی کو سینہ سپر ہونا چاہیے۔ کوئی شک نہیں کہ دین اسلامی اس وقت بے کسی اور بے بسی کے عالم میں تھا اُس کی آئین و تعلیم کو شام سے نکالا جا رہا تھا۔ عراق میں کوئی اُس کی حفاظت کا مرکز نہ تھا اور حجاز میں کوئی پناہ نہ تھی سب طرف سے ناامید ہو کر وہ دین حسینؑ کے دامن میں پناہ لے رہا تھا اور حسینؑ نے یہ طے کر لیا کہ میں جان دوں گا مگر اس دین کو بچاؤں گا۔ فقط جان ہی نہیں جان کو راہِ خدا میں مجاہد دیتے رہے تھے۔ بلکہ جان سے زیادہ عزیز دل کے ٹکڑے بھی نثار کیے جائیں گے۔ اور اس سے بڑھ کر سرایردۂ عصمت کی رہنے والی خواتین کو قید و بند کی مصیبتوں کے لیے بھی دین کی خاطر سے آیا جائے گا حسینؑ نے اپنی قربانی بھی ۶۱ سنہ ہجری میں محرم کے مہینہ میں جمعہ کے دن اور دسویں تاریخ کربلا کے میدان میں پیش کر دی۔ شہیدوں کے لاشے زمین پر تھے۔ حسین کے خیموں سے آگ کے شعلے بلند تھے۔ خواتین خاندان رسالت کی قید کا سامان تھا اور صداقت کی زبان بلند آواز سے پکار رہی تھی بے شک "دیں پناہ است حسینؑ"

شب شہادت

(وہ تقریر شب دہم محرم ۱۳۶۲ھ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

رات اندھیری ہوتی ہے مگر انسانیت کی آنکھوں میں جیسا اندھیر دسویں محرم کی رات تھا ویسا کبھی نہیں ہوا جب کربلا میں نام کے مسلمان پیغمبر اسلام کا گھر اُجاڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

شاید کوئی میری لفظوں کا مذاق اُڑائے یہ سوچ کر کہ ۷۲ بھوکوں پیاسوں سے ۳۰ ہزار کی فوج کو لڑنے کے لیے تیاری کی کیا ضرورت؟ مگر نہیں ایسا نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سے پہلے جب کوفہ کے لوگوں کو خطوط حضرت امام حسینؑ کے پاس بہت پہونچے اور اصرار حد سے بہت بڑھا تو آپ نے اپنے چچازاد بھائی کو جن کا نام مسلم تھا اپنا نمائندہ بنا کر کوفہ بھیج دیا تھا جن کے مقابلہ کے لیے یزید نے ابن زیاد کو خاص طور پر کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ اس واقعہ کی تفصیل

منظور نہیں ہے مگر تاریخ کا یہ واقعہ یادگار ہے کہ جس وقت ایک اکیلے مسلم کی گرفتاری کے لیے ابن زیاد نے تھوڑی سی فوج بھیجی تو پہلی دفعہ اُس فوج نے شکست کھائی اور محمد بن اشعث نے جو اس فوج کا افسر تھا ابن زیاد کے پاس کمک کی درخواست بھیجی۔ اس پر ابن زیاد نے تمسخر کے لہجہ میں کہلوایا کہ ایک آدمی کے مقابلہ میں اتنے لوگ کافی نہیں ہوئے جو اور مدد مانگی ہے۔ ابن اشعث نے جواب دیا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے مجھے کوفہ کے کسی بنیے یا کبڑیے کو گرفتار کرنے بھیجا ہے؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بنی ہاشم کی کھنچی ہوئی تلواروں میں سے ایک ہے۔ پھر جب ایک اکیلے مسلم نے کوفہ میں اپنی خاندانی شجاعت کا لوہا منوا دیا تو کربلا میں دسویں محرم کو تو بنی ہاشم کے کم از کم سترہ اٹھارہ شیر موجود تھے جن میں سے کچھ بچے سہی مگر عباسؑ اور علی اکبرؑ ایسے جوان بھی تھے اور خود رسول کی شجاعت کے ورثہ دار حسینؑ موجود تھے اور ان کے ساتھ سو ڈیڑھ سو عرب کے مجاہد جن میں سے بہت سوں کی میدان داری اسلام کی تاریخ میں نمایاں تھی ان کے مقابلہ فوج شام کوئی بالکل آسان بات نہیں سمجھ سکتی تھی اور کوئی کمزوری انکی طرف نہ ہوتی تو ضمیر کی کمزوری اور ایمان و یقین سے محرومی ہی بڑی کمزوری تھی جو دل کے ساتھ قدم کو بھی ڈگمگانے کے لیے کافی تھی اور اس کا اثر دیکھا جا چکا تھا۔ مدینہ میں بھی جب ولید بن عقبہ یزید کے اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہا کہ حسینؑ سے بیعت لے یا اُن کا سر قلم کر کے شام کی طرف بھیجے۔ اور مکہ میں جب کہ عمرو بن سعید بن العاص کی حکومت حسینؑ کو اپنے تئیں گرفتاری کے خطرہ سے بچا کر نکالنے سے نہ روک سکی۔ اور کوفہ میں بھی جبکہ نعمان بن بشیر نے امام حسین کے نمائندہ مسلم بن عقیل کو اٹھارہ ہزار کوفیوں سے بیعت لینے کے لیے آزاد رکھا اور پہلے ہی دن گرفتار نہیں کیا۔ یہ شاعری نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے کہ یزید کو حسینؑ کے مقابلہ میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آدمی نہ ملتے تھے تو اُن پر اطمینان مشکل معلوم ہوتا تھا۔

آج بھی ہر دھرم کا آدمی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر کوئی گورنمنٹ اُن کے کسی معبد کو گرانا کسی مقصد سے ضروری سمجھتی ہو تو کیا اُسی مذہب کے لوگ اُس کے لیے آسانی سے تیار ہو سکتے ہیں؟ کیا مسجد کو ڈھانے کے لیے مسلمانوں پر اور مندر گرانے کے لیے ہندوؤں پر بھروسا کیا جا سکے گا؟ پھر چہ جائیکہ رسول کا پیارا نواسا اور مسلمانوں کی تلواریں اُس کا خون بہائیں؟

خود عمر سعد کا دل حسینؑ کی جنگ سے لرزتا تھا اور اگر شمر نویں محرم کو ابن زیاد کا عتاب نامہ لے کر نہ آجاتا اور عمر سعد کو یقینی طور پر اپنے منصب اور عزت بلکہ جان و مال کا بھی خطرہ محسوس نہ ہوتا تو وہ اب بھی حضرت امام حسینؑ سے مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اُس کی فوج میں ہزاروں آدمی ایسے تھے جو فقط روپیہ پیسہ کی لالچ سے ہی اس بڑے اقدام کے لیے تیار ہوئے تھے مگر وہ حسینؑ کی عظمت اور صداقت کو اسی طرح محسوس کر رہے تھے جیسے ہم دوپہر کو سورج کی روشنی محسوس کرتے ہیں یقیناً اس بڑے تاریخی اقدام کے لیے اس فوج کو بڑی تیاری کی ضرورت تھی۔ ادھر حضرت امام حسینؑ اپنے مقصد کی تکمیل کی تیاریاں کر رہے تھے اور تیاری کرنا نہ ہوتی تو اس ایک رات کی مہلت مانگ کر لی نہ ہوتی۔ مگر اس تیاری کی نوعیت الگ تھی۔ کوئی تاریخ نہیں بتلاتی کہ اس شب کو حضرت امام حسینؑ نے کچھ ہتھیار فراہم کیے ہوں۔ لڑائی کے موقع کے لیے کمینگاہ تلاش کی ہو جنگ کا نقشہ مرتب کر کے اپنے ساتھیوں کو مقابلہ کی ترکیبیں بتائی ہوں اور کچھ ہدایات کی ہوں۔ ہرگز نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ آپ نے اپنے بعد کے لیے پسماندگان کو کچھ وصیتیں کی ہوں۔ اپنے اہل حرم کو اُن آئندہ کے امتحانات کے واسطے تیار کیا ہو جو آپ کے بعد انھیں برداشت کرنا ہوں گے۔ ایسا بھی نہیں۔

پھر آخر آپ نے یہ رات کی مہلت مانگ کر کیوں حاصل کی؟ اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو آپ نے خود فرمایا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے خالق کی عبادت ایک رات اور کر لوں۔ اور ایسا ہوا بھی کہ رات کا بڑا حصہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں

نے تسبیح و تہلیل اور عبادت میں صرف کیا اور اُس رات کے سناٹے میں اُن مجاہدین کی تلاوت قرآن اور مناجات کی آواز یوں گونج رہی تھی جیسے مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔

اس کے علاوہ آپ نے اس رات کو جو کام انجام دیے اُن کی فہرست یہ ہے:۔

(پہلے) اپنی زندگی تک خواتین کے پردہ کا تحفظ۔ آپ کو اپنے مقابل جماعت کے اسلام اور شرافت کی حقیقت معلوم تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ایسے پست فطرت ہیں کہ انھیں قوم عرب کی حمیت و غیرت کے عام اصول کا بھی کوئی پاس نہ ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اثنائے مقابلہ میں یہ لوگ پشت کی طرف سے خیموں پر حملہ کر دیں اس خیال سے آپ نے ایک گہری خندق خیموں کی پشت پر کھدوا دی اور اُس میں آگ روشن کرا دی تاکہ مقابلہ ایک ہی طرف سے ہو اور گھر جانے کا بھی اندیشہ نہ ہو اور خیموں پر حملہ کا بھی خطرہ دور ہو۔

(دوسری) بات یہ تھی کہ آپ نے اپنے تمام اصحاب کو جمع کیا اور موقع کی نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ کوئی جوش دلانے والی تقریر کریں گے اور اپنے ساتھیوں کو کل کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کریں گے یا اس جنگی کونسل میں کل کی جنگ کے لیے کچھ تجاویز پر غور کریں گے اور سپاہیوں سے مشورہ لیں گے مگر نہیں ایسا نہیں ہوا۔ میں اپنی ایک ریڈیو کی تقریر میں جو "اصحاب حسینؑ" کے عنوان سے دو برس پہلے براڈکاسٹ ہوئی تھی اس واقعہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت ملک کے گزشتہ قریبی دور کے مشہور ادیب منشی پریم چند صاحب کی لفظوں میں سنئے، وہ لکھتے ہیں:۔

"میدان جنگ آراستہ ہو گیا ہے، حضرت حسین اپنے جاں نثار رفیقوں کو میدان جنگ سے لوٹ جانے کی تحریک کرتے ہیں مجھے اس کا فخر ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے ایسے سعادت مند عزیز اور ایسے جاں نثار دوست عطا کیے آپ نے دوستی کا حق پوری طرح ادا کر دیا۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ حق کے سامنے آپ جان و مال کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اسلام کی تاریخ میں آپکا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔ میرا دل اس خیال سے پاش پاش ہو جاتا ہے کہ کل میرے باعث وہ لوگ جنھیں زندہ رہنا چاہیے شہید ہو جائیں گے۔ مجھے سچی خوشی ہوگی اگر تم لوگ میرے دل کا یہ بوجھ ہلکا کر دو گے میں بڑی خوشی سے ہر ایک کو اجازت دیتا ہوں کہ اُسے فیصلہ کرنے کا کامل اختیار ہے۔ میرا کسی پر کوئی حق نہیں ہے۔ میں تم سے التماس کرتا ہوں کہ اسے قبول کرو۔ یہ دیکھو میں یہ شمع بجھائے دیتا ہوں جس میں کسی کو حجاب نہ ہو۔ مگر ایک فرد بھی اس دوستانہ فہمائش سے فائدہ نہیں اُٹھاتا۔

بوڑھا زہیر بن قین سا صحابی کہتا ہے اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے کہ میں آپ کی حمایت میں زندہ جلا دیا جاؤں گا اور پھر زندہ ہو کر جلایا جاؤں گا اور یہ عمل ہشتاد مرتبہ ہوتا رہے تو بھی میں آپ سے جدا نہیں ہو سکتا،

یہ جوش حق تھا جس نے معرکۂ کربلا کو روحانی اہمیت دے رکھی ہے۔"

یہی اس رات کی مہلت لینے کا بڑا مقصد تھا کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دے دیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسا شخص رہ جائے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے مجبوراً آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا ہو۔

آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ فریق مخالف کی فوج کو بھی اس ایک رات کا موقع غور و فکر اور حق و باطل کے موازنہ کے لیے دیدیں اور حسینؑ کی یہ کوشش رائگاں نہیں گئی بلکہ اس ذریعہ سے حسینؑ کے اصول کو وہ بڑی فتح حاصل ہوئی جو دنیا کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ جتنے اسباب دل کے بڑھانے والے ہوتے ہیں وہ سب فوج مخالف میں موجود تھے کثرت فوج راحت و آرام سلطنت کی طرف سے سپاہی کو کامیابی کا یقین تنخواہ کا دباؤ اور مزید جاگیر و انعام کی توقعات۔ اس کے خلاف جتنے اسباب ہمت کو توڑ دینے والے ہوتے ہیں وہ حسین کی طرف تھے۔ بے کسی اور بے بسی، قلت تعداد، رسد کا مفقود ہونا پانی کی نایابی اور اس سب کے بعد تباہی کا یقین۔ پھر بھی آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا اور کوئی غلط مورخ بھی ایسی نہیں بتلاتا ہو کہ کوئی ایک شخص بھی ادھر کا ادھر گیا ہو۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت امام حسین کی طرف کا کوئی شخص فوج مخالف کی طرف چلا گیا ہو۔ مگر ادھر کا کم از کم ایک اور وہ بھی معمولی سپاہی نہیں بلکہ ایک ہزار سوار کا افسر حر بن یزید ریاحی فوج عمر سعد سے جدا ہو کر حضرت امام حسینؑ کی طرف آ گیا۔ یہ اسی ایک رات کی مہلت کا اثر تھا۔ اسی میں حر کے دل و دماغ میں جنگ ہوتی رہی اور آخر حق نے فتح پائی اور باطل کو شکست ہوئی۔ یہ حسینی اصول کی وہ بے پناہ فتح تھی جو حسینؑ کی زندگی میں ابن زیاد اور اس کی تمام فوج کو نظر آئی اور یہ اسی ایک رات کی مہلت کا نتیجہ تھا۔

شب شہادت

(جو تقریر شب دہم محرم سنہ ۱۳۷۱ھ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

ایک کہاوت بہت زبانوں پر چڑھی ہوئی ہے کہ "کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں" اس کا مطلب خواہ کچھ بھی ہو مگر یہ بالکل صحیح بات ہے کہ کربلا کی دسویں محرم کا تاریخ میں جس طرح دن بہت بڑا ہے اسی طرح رات بھی۔

یوں تو "رات" کے لفظ کے ساتھ ہی دن کی بہ نسبت کچھ نہ کچھ اندھیرے کا تصور ہوتا ہے مگر سنہ ۶۱ھ کی دسویں محرم کی رات کو حقیقت یہ ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔

اسے اندھیرا کہیے یا عالم انسانیت میں اندھیر کہ پیغمبر اسلام کے کلمہ گو اور مسلمان ہونے کے دعویدار خود پیغمبر اسلام کے گھر کو برباد کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور رسول خداؐ کے اس نواسے کو جسے آپ جان و روح سے زیادہ عزیز رکھتے تھے تلواروں، تیروں اور نیزوں کا نشانہ بنانے کو ہمہ تن آمادہ ہو گئے تھے آج مدینہ میں اندھیرا تھا اس لیے کہ رسول خدا کے خاندان کا آخری چراغ آپ کی قبر سے جدا ہو کر آندھیوں کی زد پر تھا۔ مکہ میں اندھیرا تھا اس لیے کہ وارث کعبہ کو زندگی کے آخری حج کرنے کا موقع نہ مل سکا اور وہ حج کی تکمیل میں ایک دن باقی رہنے کی حالت میں ۹ ذی الحجہ کو حج کا ارادہ ملتوی کر کے سفر غربت کے لیے مجبور ہو گئے تھے۔ کوفہ میں اندھیرا تھا اس لیے کہ وہ کوفہ جو علیؑ کا پایۂ تخت رہ چکا تھا آج فرزند علیؑ کے قتل کے لیے چھاؤنی بنا ہوا تھا اور کوفہ کی قابل جنگ آبادی پوری کربلا کی طرف

انڈیل دی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک حسینؑ اور اُن کے بہتر ساتھیوں کے مقابلہ کے لیے کم از کم بتیس ہزار کا
لشکر اکٹھا ہو گیا تھا۔ شام کے اندھیر کو تو یہ چھپے ہی نہیں کہ رسولِ خداؐ کے تختِ خلافت پر آج
اُن کے موروثی دشمنوں میں سے اُس شخص کا قبضہ تھا جو کھلم کھلا شراب پیتا، نماز ترک کرتا اور جنسی
تعلقات میں محرم اور نامحرم کی تفریق پر بھی عامل نہ تھا۔ یہی تو وہ ناقابلِ برداشت صورتِ حال تھی جس کے
مقابلہ کے لیے رسولؐ کی شریعت کے محافظ حسینؑ نے اپنی جان، مال، اولاد اور عزت ہر قابلِ لحاظ
چیز کو قربانی کے لیے پیش کر دیا اور یہ طے کر لیا تھا کہ سب کچھ جائے مگر میں یزید کو اپنے نانا پیغمبر
اسلام کا صحیح جانشین تسلیم نہیں کر سکتا۔

کربلا میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اگرچہ دسویں کو چاند نکلتا ہے مگر عرب کے
پر گرد و غبار ریگستان کا چاند بھی اندھیرے کی ایک نقاب اپنے چہرہ پر ڈال کر نکلتا ہے۔ جب چاند کا
یہ عالم ہو تو تاروں کا پوچھنا ہی کیا۔ فوجِ شام کے دل و دماغ پر تاریکی چھائی ہوئی تھی اس لیے کہ
وہ جان بوجھ کر پیغمبرِ خداؐ کے بے گناہ فرزند کو قتل کرنے جا رہے تھے اور حسینی جماعت میں ماؤں،
بہنوں اور بیٹیوں کی آنکھوں میں دنیا تاریک تھی کہ اُن کے بیٹے، باپ اور بھائی بس کل تک کے مہمان ہیں۔
بچوں کی آنکھوں کے سامنے پیاس کی شدت سے دھواں چھایا ہوا تھا اور رات کے سناٹے میں
نہرِ فرات کے بہنے کی آواز جو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بہت قریب سے آ رہی ہے ان کی پیاس میں
مزید اضافہ کر رہی تھی حالانکہ وہ بہت نزدیک ہونے کے باوجود ان سے بہت دور تھی کیونکہ
آج پورے دو دن ہو چکے تھے کہ نہر پر فوجوں کا پہرہ لگ گیا تھا کہ حسینؑ اور اُن کے چھوٹے
چھوٹے بچوں تک ایک قطرہ بھی پانی کا پہنچ نہ سکے

ان تمام تاریکیوں میں بس اگر کوئی شے بڑی روشن اور تابناک تھی تو وہ شہیدوں کا
مستقبل اور حسینؑ کا چہرہ جو ان تمام ظاہری غم و حسرت و یاس و حرمان کے ہجوم میں بھی
مطمئن نظر آ رہا تھا بلکہ حسینؑ کی خاص صفت یہ تھی کہ جتنا وقت سخت ہوتا جاتا تھا
اتنا حسینؑ کا چہرہ اور دمکتا جاتا تھا۔

یہ زندگی کی رات حسینؑ نے مانگ کر بڑی مشکل سے حاصل کی تھی کیونکہ
نویں تاریخ سہ پہر کو صلح کی گفتگو کا خاتمہ ہو گیا اب زیاد حاکم کوفہ کے اُس خط سے جو
کربلا [illegible] دشمن فوج کے سالار ابن سعد کے پاس آیا تھا کہ حسینؑ سے قطعاً کوئی صلح کی

گفتگو نہ کی جائے بلکہ اُنھیں مجبور کیا جائے کہ یا بیعت یزید کریں یا جنگ قبول کریں۔ حسینؑ کی نفس کی بلندی، ضمیر کے استحکام اور عمل کے استقلال کو ابن سعد خوب جانتا تھا۔ اس لیے خط کو دیکھتے ہی اُس نے کہا کہ واللہ ان حسینا لا یبایع ان نفس ابیہ بین جنبیہ "بخدا حسین بیعت تو نہیں کریں گے۔ یقیناً ان کے باپ کا دل اُن کے سینہ کے اندر ہے۔" اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یزید کی بیعت خود فوج یزیدی کے سالار کی نگاہ میں بھی ایسی ناقابل برداشت چیز تھی جسے حسینؑ کو کبھی گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ اب یہ اُس کے ضمیر کی کمزوری تھی کہ حسینؑ کو بے گناہ سمجھنے کے باوجود وہ جائزہ و انعام یا حکومت رے کی ہوس میں بھی حسینؑ سے جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔

اُس نے فوراً حکم دے دیا جس پر فوج دشمن نے حسینی جماعت پر یلغار کر دی۔ حضرت امام حسینؑ نے اپنے بھائی ابو الفضل العباس کو بھیج کر دریافت کرایا کہ اس اچانک حملہ کا کیا سبب ہے؟ بتایا گیا کہ امیر کا حکم آیا ہے کہ یا حسین بیعت کریں یا قطعی طور پر جنگ کی جائے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد حضرت امام حسینؑ نے ایک شب کی مہلت طلب کی۔

یہ مہلت اس لیے نہ تھی کہ یزید کی بیعت کے مسئلہ پر غور کیا جائے کیونکہ یہ تو پہلے ہی سے طے شدہ امر تھا کہ یزید کی بیعت ممکن نہیں ہے بلکہ اس رات کی مہلت لینے سے آخری بار عبادت الٰہی کے ادا کرنے کے علاوہ یہ منظور تھا کہ ساتھیوں کو اس کا موقع دے دیں کہ جس کا دل چاہے آپ کے ساتھ رہے اور جس کا دل چاہے وہ چلا جائے۔

تاریخ عالم میں امام حسینؑ کے اس کردار کا جواب ملنا بہت دشوار ہے۔ عام طور پر سخت اور ناگوار ماحول میں انسان اپنے ساتھیوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کرتا ہے خصوصاً ایک مذہبی رہنما کی حیثیت سے بہت آسان تھا کہ امام نہایت مؤثر الفاظ میں عذاب آخرت سے ڈرا کر اپنی جماعت کو اپنے ساتھ رہنے پر آمادہ کرتے جو بلاشبہ صحیح بھی ہوتا مگر یہاں یہ صورت اختیار نہیں کی گئی۔

حضرت امام حسینؑ نے اس رات اپنے اصحاب کو خاص طور پر جمع کر کے جو خطبہ پڑھا وہ تاریخوں میں بالکل منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اُس میں نہ خطیبانہ جوش و خروش تھا نہ واعظانہ تخویف کے انداز، بالکل سادہ الفاظ میں یہ کہا گیا تھا کہ دیکھو کل ہمارا اور اس جماعت کا فیصلہ کن دن ہے۔ انھیں میرے مطلب ہے اور میرے سوا کسی سے انھیں سروکار نہیں ہے لہٰذا تم لوگ میرے ساتھ کیوں اس خطرہ میں مبتلا ہو۔ یہ رات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ راستے کھلے ہوئے ہیں

اس پردۂ شب میں مجھ سے رخصت ہو کر چلے جاؤ۔
آپ نے مذہبی پابندیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی فرما دیا کہ میں اپنی بیعت کی
ذمہ داری تم پر سے ہٹائے لیتا ہوں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے انھیں آخرت
کے متعلق اطمینان دلا دیا کہ اگر میری اجازت سے فائدہ اٹھا کر تم جانا چاہو تو
تمھیں کسی سزائے اخروی کا بھی اندیشہ نہ کرنا چاہیے۔

عموماً اہل مذہب پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ عبادات و اعمال میں حور و قصور کے
وعدہ اور جہنم سے خوف کا لحاظ کر کے کردار کی بے لوثی کو باقی نہیں رکھتے اور
اس میں نفسانی خواہشوں کی شرکت ہو جاتی ہے۔ حسینؑ کربلا کے جہاد میں اپنے
ساتھیوں میں سے ہر ایک کے عمل کو اس معیار بلندی پر دیکھنا چاہتے تھے جہاں
سوائے حقانیت، سوائے للہیت اور سوائے احساس فرض انسانیت کے
کوئی بھی جذبہ یا دباؤ انھیں متاثر نہ بنا رہا ہو۔

امام حسینؑ نے انھیں جانے کی کھلی ہوئی اجازت دے دی مگر مجمع میں سے ایک
فرد نے بھی اس زندگی کا جو انھیں "بغیر اندیشۂ فردا" مل رہی تھی
خیر مقدم نہیں کیا بلکہ اپنی زندگیاں بطوع بالاختیار حسینؑ کے قدموں پر ڈال دیں
انھوں نے جو جواب دیے ان میں سے ہر لفظ آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ وزنی
ہوگئی اس لیے کہ اس میں خالص حقیقی شعور کی آزادی رائے اور خود ارادی فیصلہ کا
جوہر کارفرما ہے۔ کسی نے کہا کہ یا ابن رسول اللہ آپ کے بعد زندگی خود ایک عذاب ہے۔
کسی نے کہا "ابھی میرے ہاتھ میں تلوار اور میرے پاس نیزہ موجود ہے۔ اگر یہ ہتھیار
نہ بھی رہیں تب بھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ کسی نے کہا اگر قتل کیا جاؤں۔ پھر
جلا دیا جاؤں۔ میری خاک ہوا میں منتشر کر دی جائے اور زندہ کیے جانے کے بعد پھر ایسا
ہو اور یہ ستر مرتبہ ہو تب بھی نہیں ہٹ سکتا کہ جو جان ابھی قدموں پر نثار ہو۔
راحت و اطمینان کے موقع پر دوستوں کے دربار میں خوشامدی لوگ مبالغہ کی حد
کر دیتے ہیں مگر ہنگام مصیبت و بلا میں خطرہ کے سر پر ہونے کی حالت میں ایک
غریب الوطن مسافر کے سامنے جب اس طرح کی باتیں کہی جا رہی ہوں تو ان میں سوائے
خلوص کے اور جذبہ ہی کیا سکتا ہے؟ اور اگر اس وقت کسی ناواقف شخص کو ان

الفاظ کی صداقت میں شبہہ محسوس ہو تو کچھ زیادہ انتظار کی ضرورت نہ ہوگی۔

اسی رات کے گزرنے کے بعد جو دن آئیگا وہ کربلا کے تختۂ خاک پر بہتے ہوئے خون کی تحریر سے ان الفاظ کے عمل میں آنے کی تاریخ مرتب کریگا اور پھر چند گھنٹوں کے بعد انہی باتیں کرنے والوں کے کٹے ہوئے سر نیزوں پر بلند ہونگے اور اس وقت اگرچہ ان کی زبانیں خاموش دکھائی دیتی ہونگی مگر دل سے سننے والوں کو ان کا یہ اعلان سنائی دے سکیگا کہ دیکھو جب ہم نے کہا تھا وہ کر دکھایا۔ اگر زندگی میں حسینؑ کے قدموں پر رہے تو لاشے ہمارے خاک کے اندر حسینؑ کی لاش کے قدموں کے پاس ہیں اور سر ہمارے نیزوں پر حسینؑ کے سر کے پیچھے ہیں اور اسی کی قدردانی تھی جو حسینؑ کے آخری وارث امام عصرؑ نے انکو مخاطب کرکے آواز دی، بابی انتم وامی طبتم و طابت الارض التی فیہا دفنتم وفزتم واللہ فوزا عظیما "میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں تم بھی پاک ہوئے اور وہ زمین بھی پاک ہوگئی جس میں تم دفن ہوئے اور بخدا تم نے ایک عظیم کامیابی حاصل کی۔ فیا لیتنی کنت معکم فافوز معکم کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی میں شریک ہوتا۔

ہمارے دل میں بھی نصرت حق کا یہی ولولہ ہونا چاہیے۔ آئیے ہم آپ مل کر کہیں یا لیتنا کنا معکم فنفوز فوزا عظیما۔

آپ کو معلوم ہے کہ جتنے اسباب دل کو بڑھانے والے ہوتے ہیں وہ سب فوج مخالف میں موجود تھے۔ کثرت، قوت، راحت و آرام، سلطنت کی پشت پناہی، کامیابی کا یقین، تنخواہ کا دباؤ اور مزید جائزہ و انعام کی توقعات۔ اس کے برخلاف جتنے اسباب ہمت کو توڑ دینے والے ہوتے ہیں وہ حسین کی طرف تھے۔ بے کسی اور بے بسی، قلت تعداد، رسد کا مفقود ہونا، پانی کی نایابی اور اس سب کے بعد تباہی کا یقین۔ پھر بھی آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا اور کوئی غلط روایت بھی ایسی نہیں ہے جو بتلاتی ہو کہ کوئی ایک شخص بھی ادھر کا ادھر گیا ہو۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت امام حسین کی طرف کا کوئی شخص ٹوٹ کر فوج مخالف کی طرف چلا گیا ہو مگر ادھر کم از کم ایک اور وہ بھی معمولی سپاہی نہیں بلکہ ایک ہزار سواروں کا افسر حر بن یزید ریاحی فوج عمر سعد سے جدا ہو کر حضرت امام حسین کی طرف آگیا۔ یہ اسی ایک رات کی مہلت کا اثر تھا۔ اسی میں حر کے دل و دماغ میں جنگ ہوتی رہی اور آخر حق نے فتح پائی اور باطل کو شکست ہوئی۔ یہ حسینی اصول کی وہ بے پناہ فتح تھی جو حسین کی زندگی میں ابن زیاد اور اس کی تمام فوج کو نظر آئی اور یہ اسی ایک رات کی مہلت کا نتیجہ تھا۔

شہادت زارِ کربلا

(جو تقریر شب یازدہم محرم ۱۳۶۳ھ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

کس کے دل میں اتنی طاقت ہے کہ وہ آج شہادت زارِ کربلا کی سیر کرے۔

ایک دل الجھانے والی خاموشی، ایک دم گھٹانے والی اداسی۔ وہ قافلہ جو دوسری محرم کو اس سرزمین پر اترا تھا آج اپنا اسباب باندھ کر چلا جا چکا ہے اس پر سناٹا چھایا ہوا ہے —— یقیناً یہ منظر دل ہلا دینے والا ہے مگر انسان بھی عجیب چیز ہے۔ وہ ہر نئے حادثہ کی کیفیتیں دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ چاہے بعد میں اس کو تکلیف بھی پہونچے۔ پھر بھی وہ واقعات معلوم ضرور کرتا ہے جب ایسا ہے تو ذرا دل مضبوط کر کے میرے ساتھ چلو اور کربلا کے مختلف مناظر کی اس وقت سیر کرو۔

وہ دیکھو ایک بے شمار خیموں اور چھولداریوں کا سلسلہ جن میں سے اکثر میں چراغ روشن ہیں۔ اور وہ بہت سے خیموں کے جھرمٹ میں ایک بڑا خیمہ جس میں تیز روشنی ہے —— ضرور یہ روشنی تمہاری نگاہ کو سب سے پہلے جذب کرے گی اس لیے چلو یہاں دیکھ لیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ یزیدی فوج کے سالار عمر سعد کا خیمہ ہے جہاں اس وقت فتح کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ تمام بڑے بڑے افسر جمع ہیں۔ پیغمبر اسلام کے نواسے کا تین دن کی بھوک پیاس میں خنجر ظلم سے گلا کاٹنے والے اپنے کارنامے پر ناز کر رہے ہیں اور ایک ایک شہید کی شجاعت کے تذکرہ کے ساتھ اس کے قتل کرنے والے کی تعریفیں ہو رہی ہیں —— اگرچہ سیکڑوں خیموں سے اس وقت زخمیوں کی کراہ کی آواز اور بیبیوں سے مقتولین کے غم میں نالہ و شیون کی آوازیں بھی بلند ہیں مگر نتیجہ کی کامیابی نے کانوں کو اس طرح کی آوازوں سے بند کر دیا ہے اور شراب ناب کے دور سے زیادہ فتح و ظفر کا نشہ سب کو بیخود بنائے ہوئے ہے۔ یقین ہے کہ تم سینہ میں ایک شریف انسانی دل رکھتے ہو اس لیے اس منظر کو دیکھ کر خوشی میں شریک ہونے کے بجائے نفرت و حقارت کے جذبات محسوس کرنے لگو گے۔ تمہارا ضمیر ملامت کرے گا اور تمہاری انسانیت چیخ اٹھے گی۔ بھلا وہ فتح بھی کوئی فتح ہے جسے کم از کم تیس ہزار کی فوج بہتر بھوکوں اور پیاسوں کے

مقابلہ میں اپنے لاتعداد سپاہیوں کو کھو کر جنگ مغلوبہ سے حاصل کرے۔ وہ بہتر جن میں سب لڑنے کے قابل بھی نہوں بلکہ اُن میں اسی برس کا بڈھا اور چھ مہینہ کا بچہ بھی داخل ہو۔ کیا اس فتح پر ناز کرنا انتہا درجہ کی کم ظرفی اور پست نگاہی نہیں ہے؟ — کیا یہ فتح حقیقتہً فتح ہے — نہیں نہیں وہ شکست ہے جس کی گرد مذلت اس فوج اور اُس کی ظالم حکومت پر ہمیشہ کے واسطے چھائی رہے گی۔

یہ خیالات یہاں کے طرب و نشاط کے سامان، خوشی و مسرت کے شادیانوں اور نائے و نوش کی دلچسپیوں کو ایک حساس دل کے لیے بے کیف بنا دیتے ہیں — جی گھبرانے لگتا ہے اور بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ یہاں سے نکل کر میدان کی کھلی ہوا میں سانس لے کر غم غلط کیا جائے ——— وہ دیکھو نہر فرات لہریں لے رہی ہے — پانی دور پرے نظر آرہا ہے کیونکہ راستہ صاف ہے — وہ پہرا جو تین دن سے اس پانی پر بیٹھا ہوا تھا اُٹھ چکا ہے۔ وہ ہزاروں سپاہیوں کے پرے جو رات دن جمے رہتے تھے آج ہٹائے جا چکے ہیں۔ اس لیے کہ وہ شیر جن کے نیم جان بنانے کے لیے پانی کی بندش ہوی تھی لڑ بھڑ کر ساحل فنا کے اُس پار پہونچ چکے ہیں۔

دریا کا کنارا پریشان دل کے سکون کے لیے بہترین جگہ ہے — مگر دریا کے ساحل پر خون کی بو آرہی ہے — موت کے قدموں کے نشان ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کسی شیر کے نعروں کی صدا اب تک گونج رہی ہے۔ گرے ہوئے خون کا سلسلہ رہنمائی کرتا ہوا آگے لے جاتا ہے۔ قدم ٹھٹکتے ہیں۔ دل دھڑکتا ہے۔ ایک لامعلوم رعب کا احساس دور باش کی صدا دیتا ہے — غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ترائی میں ایک شیر آرام کر رہا ہے جس کے گرد و پیش بہت دور تک ساحل کی تمام بالو خون سے گندھی ہوی ہے۔ جسم تمام زخموں سے چور ہے۔ سر شگافتہ ہے۔ ہاتھ دونوں جسم سے جدا ہیں مگر کٹے ہوے ہاتھ کے شانہ میں مشک کا تسمہ اب تک پھنسا ہوا ہے۔ وہ مشک جس میں سوراخ ہے اور اُس کا پانی تمام بہہ چکا ہے جس نے بہادر کے جسم سے بہے ہوے خون کی روانی میں اضافہ کر کے زمین مقتل کو دور تک رنگین بنا دیا ہے — ڈھال تو بہت دور پڑی ہے مگر تلوار دہن کے قریب ہے جھنڈا جو ہوا میں لہرا رہا تھا وہ اب زمین پر ہے مگر بہادر کا سینہ علم کا اب بھی محافظ ہے۔

یہ ہے علی کا شیر حسین کا قوت بازو اور علمدار۔ پیاسی سکینہ کا سقا قمر بنی ہاشم عباس جو حسینی فوج کا سب سے آخری سپاہی تھا جس نے سب سے آخر میں حسین سے اجازت جہاد طلب کی مگر امام نے پھر بھی لڑنے کی اجازت نہیں دی۔ فقط بچوں کی پیاس بجھانے کے لئے پانی کی سبیل کرنے کا حکم دیا۔ وفادار عباس کی یہ یادگار کامیابی تھی کہ وہ فوج کا پہرہ ہٹا کر مشک میں پانی بھر لینے میں کامیاب ہوئے۔ مگر افسوس کہ بھری ہوی مشک کو لے کر خیمہ تک پہونچنا ممکن نہوا — تیر نے مشک کو چھید کر تمام پانی بہا دیا اور عباس نے سیکڑوں زخم کھا کر اپنے جسم کا تمام خون بہا دیا۔

عباس مشک و علم کے ہوتے ہوئے بھی دشمن کے احساس میں بے بس نہیں تھے۔ آخر دونوں ہاتھ جدا کر دیے گئے پھر بھی عباس جب تک خود گھوڑے سے نہیں گرے۔ علم کو زمین پر گرنے نہیں دیا۔ مگر وہ علم اس کے بعد بھی حقیقت میں گرنے نہیں پایا۔ آج ہزاروں علم اُسی ایک علم کی یاد میں ہزاروں کے کاندھوں پر اُٹھ رہے ہیں اور ہر تعزیہ خانہ میں حسینؑ کے نام کی ضریح تو ایک ہوتی ہے مگر علم کثرت کے ساتھ نصب ہوتے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس کا کہ عباسؑ گو دنیا میں نہ رہے مگر اُن کا علم آج تک اونچا ہے اور ہمیشہ اونچا رہے گا کیونکہ حق کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔

یہ منظر یقینی اگر ایک طرف دل میں جوش، ولولۂ حق پر مرنے کا حوصلہ پیدا کرتا اور رگوں میں خون کی روانی بڑھاتا ہے

تو دوسری طرف ایک ایسے بہادر کی لاش کا یہ جان فرسا عالم دل کی رگیں بھی توڑنے لگتا ہے۔ بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔ وہ آنسو جو بزدلی نہیں بلکہ بہادری کی قدر و قیمت کے احساس کا نتیجہ ہیں اور عزم و ہمت کی آگ کو افسردہ نہیں بلکہ اُس کی شعلہ افروزی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔

دل تو چاہتا ہے کہ حسرت کے اسی ایک منظر میں غرق ہو جائے مگر ساحل کی بلندی سے صحرا کا گلگوں تختہ صاف نظر آتا اور نگاہ کو کشاں کشاں اپنی طرف لے جاتا ہے۔

یہاں کوئی ایک ہی مرقع نہیں ہے جو توجہ کا مرکز بن سکے بلکہ سچ سچ "شہادت زار" تو یہی جگہ ہے۔ دور تک لہو کا چھڑکاؤ ہے جابجا خون کے تھالے بندھ گئے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے نیزے، شکستہ تلواریں، کٹے ہوئے تیروں کے انبار ہیں جو ادھر اُدھر لگے ہوئے ہیں دشمنوں کے سر ہزاروں کی تعداد میں زمین پر لنڈھک رہے ہیں اور لاشے بھی بہت دور تک نظر آتے ہیں۔ ان سب کے بیچ میں بہتر یا زیادہ سے زیادہ سوا سو نورانی مجسمے خاک و خون میں آلودہ اس عالم میں ہیں کہ کسی کا جسم تیروں سے چھلنی ہے۔ کسی کا سر گرز سے شگافتہ، کسی کا پہلو خنجر سے چاک اور کسی کا سینہ نیزہ سے فگار ہے۔

ان میں ساٹھ، ستر اور اسی برس تک کے بڈھے۔ ۱۸ سے لے کر ۳۵ برس تک کے جوان اور گیارہ بارہ برس تک کے کمسن بچے بھی ہیں —— ہاشمی خاندان کے جوانوں بلکہ بچوں تک کی سج دھج سب سے الگ ہے۔ ان میں ایک چاند کا ٹکڑا، تلوار کا پھل کھائے اس شان سے پڑا ہے کہ عمامہ کے پیچ خون سے رنگین ہو کر لٹک آئے ہیں۔ اور اُس حسین چہرہ پر سہرے کی طرح چھا گئے ہیں ہاتھوں میں خون کی مہندی اور سینہ پر زخموں کی بدھی ہے۔ یہ ہے حسن کا یتیم اور حسین کا عزیز بھتیجا قاسم جسے رخصت کرتے وقت امام نے مرحوم بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے اپنا داماد بھی بنا لیا تھا —— کربلائے معلیٰ میں خیمہ گاہ کے اندر ان کی یادگار میں حجلۂ عروسی بنا ہے اور ہندوستان میں ان کی یاد میں ساتویں تاریخ مہندی اُٹھتی ہے۔

انہی کے پاس اٹھارہ برس کے کڑیل جوان کا لاشا ہے، جس کے سہرے کے پھول کھلنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ علی اکبر ہیں جنھیں حسینؑ اس لیے بہت عزیز رکھتے تھے کہ وہ ہو بہو رسول اللہؐ کی تصویر تھے۔ ان کے رخصت ہوتے وقت حضرت امام حسینؑ نے اپنے خالق کو گواہ کر کے کہا تھا کہ جب ہم زیارت رسول کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کے چہرہ کو دیکھ لیتے تھے۔ آج کے خوش عقیدہ مسلمان شبیہ نعلین رسولؐ کی بھی جو کاغذ پر بنی ہو عزت کرتے ہیں مگر افسوس وہ کیسے مسلمان تھے جنھوں نے خود رسولؐ کی جیتی جاگتی ہوئی شبیہہ کا خیال نہ کیا۔ وہ حسین اور مقدس جسم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

علی اکبر کو دیکھتے ہی دل میں علی اصغر کا خیال آتا ہے۔ وہ چھ مہینے کا بچہ جسے حسینؑ نے قربان گاہ شہادت میں سب سے آخر میں پیش کیا تھا جو پیاس سے جاں بلب تھا مگر پیاس اُس کی پانی سے نہیں بلکہ پیکان تیر سے بجھائی گئی۔ ان کی لاش تلاش کرنے پر بھی شہیدوں میں نہیں ملتی۔ ہاں زمین پر ایک چھوٹی سی قبر بنی ہوئی ہے۔ یہ اصغر کی تربت ہے۔ اس بچہ کو خود امام حسینؑ نے شہادت کے بعد ہی دفن کر دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اُمت رسولؐ کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ فرزند رسولؐ کی انسانی غیرت کو خود اس منظر کے سامنے رہنے سے شرم دامنگیر ہوتی تھی۔

سب سے آخر میں نگاہ نشیب کی طرف جاتی اور وہیں ٹھہر جاتی ہے —— یہاں ایک تقدس کا ماہ پیکر، نورانی شعاعوں کا خزانہ خونیں شفق کے اندر چمکتا ہوا سورج، ایک ہمہ تن جراحت لاشہ ایسا پڑا ہوا ہے جس کا سر پہلے ہی جدا ہو چکا ہے، اس لیے صورت سے تو پہچانا نہیں جا سکتا مگر زخموں کی کثرت بتلاتی ہے کہ تمام حربوں کا اصلی مقصد اور عداوتوں کا آخری مرکز یہی تھا۔ شکستہ کمر ظاہر کرتی ہے کہ یہ وہ ہے جس کا برابر کا بھائی مار ڈالا گیا۔ بازو تیر سے چھدا ہوا خبر دیتا ہے کہ وہ ہے جس کے ہاتھوں پر چھ مہینہ کا بچہ نشانہ

تیر تم ہوا خون سے رنگین ہاتھ پتہ دیتے ہیں کہ وہ ہے جس نے بے شیر کا خون چہرہ پر مل لیا تھا۔ سینہ پر کتنا وہ گھاؤ اور پشت کے پار اُس کا نشان بتلا رہا ہے کہ وہ ہے جس کے سینہ پر تیر پڑا تو سامنے سے نکل نہ سکا، آخر پشت کی جانب سے اُسے کھینچا اور سینہ سے خون پرنالے کی طرح جاری ہوا۔ جسم کے پارہ پارہ ٹکڑے اس کی دلیل ہیں کہ وہ ہے جس کا جسم بعد شہادت گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا گیا۔

ان خصوصیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہے شرافت کی جان، انسانیت کی روح، صداقت کا مجسمہ، پیغمبر اسلام کی نشانی، علی کا فرزند حسینؑ جو کربلا کے مجاہدین کا سرگروہ اور اس ہمیشہ یاد رہنے والے کارنامہ کی مرکزی شخصیت ہے۔ جس نے جان دی مگر حق وصداقت پر آنچ نہ آنے دی۔ جس نے عزت اسلام پر اپنی ہر چیز قربان کردی اور بقول خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی از سر نو بنا قائم کر دی۔

آج ہر سال دنیا کے تمام شرق و غرب میں، محرم میں اُن ہی کا سوگ منایا جاتا ہے اور اُن ہی کی یاد ہے جو مختلف انداز دں پر برابر تازہ کی جاتی ہے۔ اور تیرہ صدیوں سے ہر سال کے بعد دوسرے سال اُس میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

تاریخ اسلام میں واقعۂ کربلا کی اہمیت

(سرکار سید العلماء مدظلہ کی وہ معرکتہ الآراء تقریر جو ۶ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ مطابق ۹ فروری ۱۹۴۶ء کو مختلف مذاہب اقوام کے ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ سے ہوئی)

تاریخ اسلام کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ مذہبی نقطۂ نظر سے تو اسلام اُس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ دنیا وجود میں بھی نہ آئی تھی اور آدم و نیز دیگر انبیاء و مرسلین اسلام ہی کا پیغام لے کر دنیا میں آئے لیکن مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص تاریخی حیثیت سے تاریخ اسلام کی ابتدا اُس وقت سے ہوتی ہے کہ جب سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے۔

اس وقت کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جن رہنماؤں کی تعلیم جاری تھی اُن میں کسی میں بھی ہمہ گیر انسانی برادری کا تخیل موجود نہ تھا بلکہ یہ تعلیمات صرف ایک قوم، ایک ملک اور ایک زمانہ میں محدود تھے۔ ہندوستان ہی کو لے لیجیے یہاں جس طرح کی تعلیم رائج تھی اُس نے اپنے پیغام کو سمندر کے حدود کا پابند بنا دیا تھا وہ اپنے ماننے والوں کو سمندر کے عبور کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا تو اُسے سمندر پار والوں کے اصلاح کی فکر کیا ہوتی۔

دوسرا بڑا مذہبی ادارہ عیسائیت کا تھا، اس کی تعلیم کا زاویۂ نگاہ جو رواج یافتہ بائبل میں پایا جاتا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ کو صرف بنی اسرائیل کا باپ قرار دیتا ہے۔ اگر اللہ کو صرف اُس کے رحم وکرم اور عنایت کی بنا پر باپ کے نام سے تعبیر کیا جا سکے تو اُس کی رحمت کا مستحق دنیا کے سارے انسانوں کو ہونا چاہیے مگر عیسائیت کی مذہبی تعلیم اس وسیع النظری سے خالی تھی۔

خود عرب کے لوگ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنا نام رکھا تھا "عرب" یعنی دل کی بات کو زبان سے ظاہر کر سکنے والے اور اپنے سوا دوسری قوموں کو کہتے تھے "عجم" یعنی گونگے۔ اس کے معنی یہ ہیں

کہ وہ اپنے سوا دیگر اقوام کی زبانوں کو انسانی زبان ماننے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ جیسے جانور کچھ آوازیں منھ سے نکالتے ہیں ویسی ہی دوسری قوموں کی بولیاں ہیں۔

ایسے زمانہ میں حضرت محمد مصطفیٰ اسلام کا پیغام لے کر آئے جس کا خاص جوہر تھا "بین الاقوامیت" یعنی وہ صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لیے تھا۔ ابھی تک کسی نے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کل انسانوں کو اخوت اور مساوات کا سبق دیا۔ ذات پات کے بدنما داغوں کو دامن انسانیت سے دھو ڈالا۔ کل انسانوں پر یکساں فرائض عائد کیے اور سب کے حقوق مساوی رکھے۔ آپ نے اعلان عام کر دیا لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی، "کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور نہ عربی کو غیر عربی پر سب آدم کی اولاد ہیں (خلقکم من نفس واحدۃ) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

یہ اب ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جبکہ ہمارے کان سنتے سنتے عادی ہو چکے ہیں لیکن جس زمانہ میں رسولؐ ان خیالات کو پھیلا رہے تھے اُس وقت دنیا ان سے بالکل اجنبی تھی۔ اُس وقت دنیا کی تمام قوموں میں برادرانہ برتاؤ کا قائم کیا جانا کیا اپنے ہی ملک و قوم کے دوسرے قبیلہ کے افراد کی اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس ماحول کے اعتبار سے رسول کا یہ اقدام ایک بڑی غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ قول سے عمل مشکل ہے۔ رسولؐ نے زبانی ہی تعلیم نہ دی بلکہ ہر موقع پر خود عمل کر کے دکھایا۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھوں سے دنیا کے سامنے ایک بین الاقوامی قوم کی تشکیل کر کے دکھا دی جس میں اگر ایک طرف حمزہ و جعفر ایسے قرشی تھے تو دوسری طرف ابوذر غفاری اور مقداد کندی ایسے غیر قرشی اور پھر سلمان فارسی، بلال حبشی اور صہیب رومی ایسے غیر عرب۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سلمان کو منا اہل البیت کہہ کے اعزاز میں اپنے خاندان کا شریک کر لیا اور بلال کو موذن کے معزز عہدہ پر فائز کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی بلند عہدہ و منصب کا اپنے ایمان و عمل سے حقدار ہو تو اس میں رنگ، نسل اور ملک کے افتراق کی ہرگز پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔

حقیقی مصلح وہی ہے کہ جو ماحول کے خلاف، رائے عامہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ضروری اقدام عمل میں لائے رسولؐ اللہ کی جانب سے تمام دنیا کے سامنے ایک ایسی تعلیم کو پیش کرنا چاہتے تھے جو اسے بلند انسانی سطح پر پہونچا دے اسی لیے اُنھوں نے تمام اقوام عالم کے سامنے ایسا انداز اختیار کیا جس میں عقل و انصاف کی رو سے کسی کو بنائے مخاصمت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تمام قدیم پیشوایان مذاہب میں اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے کہ کون پیشوا حقیقتاً منصب رسالت پر فائز تھے اور کون نہیں تھے تو وہیں سے ایک جنگ اُن شخصیتوں کے بارے میں قائم ہو جاتی جس کا کوئی عملی نتیجہ انسانی کردار کے مستقبل کے لحاظ سے نہ تھا اس لیے اُنھوں نے اقوام عالم کے گزشتہ پیشواؤں میں سے نفی کسی کی نہیں کی۔ بلکہ قرآن میں کچھ کے نام کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ رسلا قد قصصناهم عليك ورسلا لم نقصصهم عليك "کچھ پیغمبروں کا ہم نے تمھارے سامنے ذکر کیا ہے اور بہت سے پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا ہے"، ہر ایک مذہب کے قدیم پیشوا کے لیے یہ امکان باقی رہ گیا کہ اُس کا شمار بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہو اور اس طرح یہود کے لیے جس طرح یہ موقع ہے موسیٰ کی عظمت کے قائل رہتے ہوئے، عیسائیوں کے لیے موقع ہے کہ عیسیٰ کی عظمت بشری کے قائل رہتے ہوئے اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں اُسی طرح پارسیوں کے لیے موقع حاصل ہے کہ زردشت کی عظمت کو ماننے کے ساتھ، ہندوؤں کے لیے موقع ہے کہ اپنے سابق پیشواؤں کی عظمت کو انسانی حدود میں ماننے کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو قبول کر لیں۔ اب اُن سابق شخصیتوں کے احترام اور عدم احترام کوئی بحث نتیجہ خیز بھی نہیں جبکہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل سب کی طرف سے ایک

قبول کرلیا جائے اور وہ وہی کہ جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

یہی ہے بین الاقوامی جماعت کو متحدہ مقصد پر مجتمع کرنے کا صحیح طریقہ جسے اسلام نے اختیار کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی
بے شک قرآن عربی زبان میں اُترا۔ اس میں ایک پہلو تھا اس کا کہ عرب قوم جو دوسروں پر فوقیت کی دعویدار تھی اسے
اپنے لیے باعث فخر قرار دیتی مگر قرآن نے اس پہلو کی تشریح کرکے عرب کے اس فخر کو ختم کر دیا۔ اُس نے صاف الفاظ میں
کہہ دیا ولو نزلناہ علی بعض الاعجمین فقرأہ علیھم ما کانوا بہ مؤمنین یعنی قرآن کے عربی زبان میں نازل
ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ عربوں میں جہالت اور تنگ نظری ایسی ہے کہ اگر یہ کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو یہ ایمان
نہ لاتے برخلاف دوسری قوموں کے وہ اس تنگ نظری سے دور ہیں۔ وہ باوجود قرآن کے عربی ہونے کے ایمان لانے
کے لیے تیار ہو سکتی تھیں اس لیے قرآن عربی میں اُتارا گیا۔ اس طرح قرآن مجید نے جو ایک پہلو عرب کی فوقیت کا پیدا
ہوتا تھا اُسے ختم کر دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بین الاقوامیت کے یہ معنی نہ تھے کہ ایک قوم یعنی عرب کا غلبہ
تمام دوسری قوموں پر ہو جائے بلکہ اُس کے معنی یہ تھے کہ عرب اور تمام دوسری قومیں یکساں طور پر اسلام کے بلند و برتر نظریات
عقلی اور اصول اخلاقی و اجتماعی کو قبول کرکے ایک متحد قوم بن جائیں اس طرح وہ کسی سے کوئی چیز چھیننے کا درپے نہ تھا،
بلکہ سب کو مساوی طور پر کچھ دینے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا اور اسی لیے کسی دوسری قوم کا آدمی اسلام قبول کرکے کسی شکست
یا پسپائی کا احساس نہیں کرتا تھا بلکہ فخر اور نازش محسوس کرتا تھا۔

اسلام کے ان تعلیمات میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اُس نے صاف اعلان کر دیا کہ (لا اکراہ فی الدین) بلکہ
تبلیغ مذہب کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ اپنے حقانیت اور عمل سے دلوں کو مسخر کیا جائے اور اپنے اصول کو دنیا کے سامنے اس
طرح پیش کیا جائے کہ وہ اُس سے متاثر ہو کر اُس کی خوبیوں پر غور کرے اور مسلمان ہو۔

یہ ہے اسلامی تاریخ کے دور اول کا وہ سرسری بیان جس سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور رسول کے تبلیغی طریقہ کا
ایک تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کا ورق اُلٹتا ہے۔ رسول کی وفات ہوتی ہے اور مسلمانوں کے فتوحات کا
دور شروع ہوتا ہے۔

کوئی شبہ نہیں کہ ان فتوحات کی بنیاد اُسی بین الاقوامی تخیل پر تھی جو اسلام نے مسلمانوں کے دماغوں میں پیدا کیا تھا مگر اُس
بین الاقوامیت کے حصول میں پیغمبر کے طریق کار کی نوعیت پر عام طور سے غور نہیں کیا گیا یا نگاہیں اُس کی تہ تک نہیں
پہنچیں اور نہ پہنچنا چاہیے تھا کیونکہ پیغمبر کے عمق نگاہ کی توقع ایسوں کے عوام سے کہ جن کا جمہور نام ہے فضول ہی سی
چیز ہے۔ پیغمبر اسلام کے پیش نظر بھی فتوحات تھے اور مسلمانوں کی نظر بھی فتوحات پر رہی مگر فتوحات کے مفہوم میں دونوں
جگہ فرق تھا۔ مسلمانوں کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کے ملک اُن سے لے کر اپنے بنا لیے جائیں اور پیغمبر اسلام کے فتوحات
یہ تھے کہ دوسروں کو خود اپنا لیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کا ملک اپنا ہو جائے۔ پہلی قسم کے فتوحات میں زمینوں پر قبضہ کیا
جاتا ہے اور دوسری قسم کے فتوحات میں دلوں کو تسخیر کیا جاتا ہے۔

یہ فتوحات جنھیں مسلمانوں نے اپنا نصب العین بنایا اس سے ممالک تو اپنے ہو گئے مگر ممالک کے رہنے والے ان فتوحات
سے ہرگز اپنے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس طرح کی فتح کا ایک خاصہ ہے یہ کہ مفتوح قوم میں فاتح کی طرف سے جذبہ نفرت پیدا
ہوتا جائے جب دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا تو اچھائیوں پر نظر جائے گی نہیں اور جب اچھائیاں دیکھی نہ جائیں گی تو
دور میں ایمان کا رجحان کیا پیدا ہوگا۔

اس قسم کے فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح کے خلاف فردِ قرار دادِ جرم مرتب کرے اور صحیح یا غلط مظالم کی داستانیں دُہرائے۔ تاریخ پر نظر ڈالیے تو اسلامی فتوحات اس سے مستثنیٰ نظر نہ آئیں گے۔

مان لیا جائے کہ کتبخانۂ اسکندریہ کے جلانے کا الزام غلط ہے مگر اس غلط الزام کا عائد ہونا اور بالکل ایسے ہی الزام کا ایران کی طرف سے عائد کیا جانا جسے مولانا شبلی نے شعر العجم میں بھی نقل کیا ہے یعنی یہ کہ ایران کے قدیم شاعری

اور ادبی لٹریچر کا ذخیرہ باقی نہیں رہا اس لیے کہ مسلمانوں نے ایران ....

کے تمام قدیم سرمایہ کو تلف کر دیا ان غلط الزاموں کا بالکل یکساں دو ملکوں کی طرف سے عائد کیا جانا خود اس کا ثبوت ہے کہ مفتوحہ ممالک کو فاتح جماعت کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی جبکہ مخاصمت تھی ویسی ہی جیسی ہر مفتوح قوم کو فاتح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

رسولؐ نے دکھا دیا تھا کہ دیکھو ممالک یوں فتح کیے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ کو فتح یمن کے لیے بھیجا اور اُنھوں نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے تمام ملک کو اپنا بنا لیا۔ مگر مسلمانوں نے اس مثال کو یاد نہیں رکھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک تو اپنے ہو جائیں مگر ملک والے اپنے نہوں۔

آلِ محمدؐ جن کے سرگروہ حضرت علی بن ابیطالبؑ تھے اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور اُس کے نتیجہ کو محسوس کر رہے تھے اُنھوں نے مصالح سیاستِ وقت کی رفتار میں مزاحمت مناسب نہیں سمجھی مگر اُنھیں الگ تھلگ اور خاموش رہ کر بھی اُس کام کو انجام دینا تھا جو پیغمبر اسلام کی قائم مقامی ہونے کی حیثیت سے ان کے پیش نظر تھا۔ اگرچہ ان کا کام بہت مشکل بن گیا تھا مگر ایک فرض شناس شخص مشکلوں سے گھبرا کر اپنے فرض کو ترک نہیں کیا کرتا۔ اُنھوں نے اپنا کام یہ قرار دیا کہ غیر ملک کی زمینوں کو مسلمان اپنے قبضہ میں لائیں اور اُن کے دلوں کو آلِ محمدؐ اپنے عمل اور سیرت کے جذب سے اپنا بنائیں اور اس طرح اُن میں اسلام کے ساتھ حقیقی ہمدردی پیدا کریں۔

اسی مقصد سے حضرت علیؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بجائے مکہ یا مدینہ کے کوفہ کو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ یہ عراق کا مرکزی شہر تھا جو ایران اور حجاز دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کوفہ فوجی چھاؤنی تھا اور چھاؤنی میں بداخلاقیاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ ایران کے لوگ جب یہاں آتے تو وہ اُن ہی اخلاق و کردار کو جو یہاں نظر آتے اسلامی کردار خیال کرتے اور اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف اُن کی نفرت سے مستحکم ہوتی جاتی۔

جناب امیرؑ نے یہاں قیام فرما کر دوراے خاندان رسول اور اپنے تربیت دادہ سچے مسلمانوں کی جماعت کا مرکز قرار دے کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ ایران والے قریب سے اسلامی اخلاق و آئین کا مطالعہ کریں اور اُس کے بلند انسانی خصوصیات کو محسوس کریں۔ جبکہ آپ عملی طور پر اُسی بین الاقوامی مساوات کو سختی کے ساتھ نباہ کر دنیا کو دکھا رہے تھے جو پیغمبر اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ جہاں غیر قرشی مالک اشتر کی اُتنی عزت تھی جتنی بڑے بڑے خاندانی قرشیوں کی نہ تھی۔ اور قنبر غلام سے ساتھ وہ مراعاتیں تھیں جو بہت سے عربوں کے ساتھ نہ تھیں۔ جہاں انسانی حقوق میں مساوات، اتنا خیال اور ملکی و غیر ملکی تفریق کے خلاف جہاد میں اتنا اہتمام تھا کہ عرب شہنشاہ زادہ (عبید اللہ بن عمر) نے اگر ایک ایرانی (ہرمزان) کو ناحق قتل کر دیا تھا اور گزشتہ دورِ حکومت میں قاتل کی شخصیت کے اثر سے اُس کا بدلہ نہ لیا گیا تھا تو اب حضرت علی بن ابیطالبؑ خلیفہ ہونے کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ اُس ایرانی کے خون کا بدلہ لیا جانا قاتل سے ضروری ہے۔ اسلامی قانون میں عرب اور غیر عرب اور بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی گنجایش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبید اللہ بن عمر جا کر

حضرت علیؑ سے فریق مخالف یعنی معاویہ کے ساتھ مل جاتے ہیں اور پھر میدان جنگ میں حضرت علیؑ کے مقابلہ میں آکر قتل ہوتے ہیں۔

کیا اس سے اسلام کی اُس بین الاقوامیت کا جو اُس کا طرۂ امتیاز ہے ایرانیوں کو اندازہ نہ ہوا ہوگا اور کیا اس سے اُنھیں اسلام کے بلند اصول کے ساتھ ہمدردی نہیں پیدا ہوئی ہوگی۔

دوسرا واقعہ ایران کی شاہزادی کا حضرت امام حسینؑ کے عقد میں سے آنا تاکہ ایرانیوں اور عربوں میں رشتۂ اتصال قائم ہو جائے اور ملک و قوم کی تفریق کے مٹا دینے کا عملی سبق دنیا کو دیا جائے۔ اُس وقت جب شہنشاہِ فارس کی بیٹی کے دامن پر کنیزی کا داغ آرہا تھا، امیر المومنین نے اپنے عزیز فرزند کے ساتھ اُس کا عقد کر کے اُس کو دنیائے اسلام کی ملکہ بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر ایران کو اسلام کا گرویدہ بنانے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ آئندہ کے ہونے والے اسلامی پیشوا (زین العابدینؑ) اگر ایک طرف ملک عرب کے دینی شہنشاہ (محمدؐ و علیؑ) کے پوتے ہیں تو دوسری طرف ملک فارس کے شہنشاہ (یزدجرد) کے نواسے بھی ہیں۔

اس کا نتیجہ تھا کہ وہ مفتوحانہ نفرت جو ایران کو فاتح قوم اور اُس کے مذہب سے ہونا چاہیے تھی دور ہو گئی اور اگر رہی بھی تو صرف اُن اشخاص سے جنھوں نے براہ راست اُن پر فوج کشی کی تھی لیکن اسلام اور رہنمایان اسلام سے مذہبی طور پر اُنھیں کوئی نفرت نہیں باقی رہی بلکہ دلی محبت و الفت اور والہانہ شیفتگی و گرویدگی پیدا ہو گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد اسلامی علوم اور مذہب کی جتنی خدمت ایران نے کی اُتنی خود عربوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

چاہے سوادِ اعظم کے وہ قدیم اور متوسط دور کے علماء ہوں جیسے بیہقی۔ نسائی۔ طبری۔ رازی۔ دوانی۔ جرجانی۔ نیشاپوری وغیرہ اور چاہے فرقۂ امامیہ کے ہر دور کے علماء ہوں جیسے قمی۔ طوسی۔ خوانساری۔ اصفہانی۔ رشتی شیرازی۔ اندرانی۔ طہرانی۔ یزدی وغیرہ سب ہی سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور ثبوت ایران کے مذہبی شغف کا دیکھئے کہ ایران میں جمشید کا قائم کیا ہوا تہوار "نوروز" ہمیشہ منایا جاتا تھا۔ یہ "نوروز جمشیدی" کہلاتا تھا جو اعتدال ربیعی کے موقع پر قائم ہوتا تھا اس کے مقابل میں "مہرگان" تہوار تھا جو اعتدال خریفی کے موقع پر یعنی موسم خزاں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کو اپنے قومی تہواروں اور قومی تخصیتوں کے ساتھ نسبت ہوا کرتی ہے مگر چونکہ نوروز ہی کا دن مطابق ہو گیا حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی جانشینی کے دن سے تو ایران نے اپنے مخصوص تہوار کی قومی خصوصیت کو قربان کر دیا اس مذہبی خصوصیت پر جو اس تاریخ کو حاصل ہو گئی تھی اور نوروز بجائے "نوروز جمشیدی" ہونے کے "نوروز اسلامی" اور "نوروز علوی" بن گیا۔ اب اس میں اسلامی نماز پڑھی جاتی ہے اور حضرت علی بن ابیطالبؑ کے اوصاف و مناقب بیان ہوتے ہیں اور جمشید کے ساتھ جو اس دن کا تعلق تھا وہ صرف تاریخ کے اوراق پارینہ کی زینت بن کے رہ گیا ہے۔

یہ وارفتگی اور شیفتگی مذہب کے ساتھ بضرب شمشیر فتح سے حاصل شدہ نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں آل محمدؐ کے اُس اخلاقی جذب کی تاثیر ہے جس کی امیر المومنین حضرت علیؑ نے ابتدا کی اور آل محمدؐ میں سے ہر فرد نے جس کو برقرار رکھا اور امام رضاؑ نے اپنے ولیعہدی کے دور اور زمانۂ قیام خراسان میں جس کو لازوال زندگی بخشدی۔

یاد رکھیے کہ دنیا کے ہر انسان کے چال چلن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ ہر شخص لا معلوم طریقہ پر اپنے افعال و

حرکات سے دوسروں پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتا رہتا ہے اور وہ دوسرے اپنے علاوہ دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے کسی نیک شخص کی پارسائی، رحمدلی، فیاضی، ملنساری، ہمدردی وغیرہ اوصاف کو اہمیت دینا غلطی ہے مگر تاریخ کا ایک خاصہ ہے کہ وہ حرکت کو دیکھتی ہے سکون پر نظر نہیں ڈالتی۔

اگر آپ ملکوں کی تاریخ، قوموں کی تاریخ اور شخصیتوں کی تاریخ کو پڑھیے تو آپ کو جنگ، ہنگامہ، شورش اور آویزشوں کے حالات بڑے شرح و بسط کے ساتھ ملیں گے لیکن عباد و زہاد کی عبادتوں، ریاضتوں، اور تعمیر خلق کی کوششوں کا تذکرہ اکثر ملے ہی گا نہیں اور ملے گا تو ضمنی طور پر، سرسری طریقہ سے اور اختصار کے ساتھ۔

تاریخ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ فارس و روم کے غزوات تاریخ کے صفحات پر چھا گئے۔ فتوح الشام" واقدی اور فتوح البلدان" بلاذری اسم بامسمیٰ ہو کر انہی موضوعات کی حامل بن گئیں مگر ہیودیوں کے باغ میں آب کشی کر کے بسر اوقات کرنے والا پیغمبر اسلام کا جانشین اس دور کی تاریخ میں ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ حضرت علیؑ کے علاوہ دیگر اماموں کے واقعاتِ زندگی صفحاتِ تاریخ پر نہ آسکے کیونکہ اُن میں کمانوں کی کڑک، نیزوں کی لچک اور تلواروں کی چمک نہ تھی مگر خالد بن ولید سے لیکر ابو مسلم خراسانی تک جتنے جرنیل اور کرنیل تھے سب تاریخی شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ شخصیتیں دنیا کی خاموش فضا میں تلاطم پیدا کرنے کی وجہ سے تاریخ کے معیار پر پوری اُترتی ہیں اور زین العابدینؑ، محمد باقرؑ، جعفر صادقؑ، موسیٰ کاظمؑ وغیرہ اپنی عبادت، اپنے علم، اپنے صدق، اپنے ضبط نفس وغیرہ صفات کمال سمیت تاریخی معیار پر پورے نہیں اُترتے اس لیے کہ وہ اپنی خاموش سیرت کے ساتھ دنیائے اسلام کی تعمیر میں کتنا ہی حصہ لے رہے ہوں مگر اُن کی زندگی میں سکون ہے۔ اور سکون تاریخ کا جزو بننے کے قابل نہیں۔ اس صورت سے جو اسلامی تاریخ مرتب ہوئی ہوتی اُس میں یقیناً بس وہ خون آشام لڑائیاں ہوتیں جو اشاعت اسلام کے نام پر فتوحات کی حیثیت سے آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کی صورت میں ہوئیں اور ایسی تاریخ سے مسلمان اپنی جگہ کتنی ہی نازش محسوس کرتے مگر غیر اقوام کی ہمدردی کا کوئی سرمایہ ان سے دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ضرورت تھی ایک ایسے واقعہ کی جس میں ہو تو نوعیت جنگ کی، ہو باہمی تصادم اور کشمکش، زمین پر بہتے ہوئے خون اور تڑپتے ہوئے لاشے ہوں۔ فتح اور شکست اور غالب و مغلوب کا انجام ہو خلاصہ یہ کہ وہ سب باتیں ہوں جن کی وجہ سے تاریخ کی نگاہ اُٹھتی ہے۔ جن کی وجہ سے تاریخ اپنی آغوش کو کھولتی اور واقعات کو جگہ دے دیتی ہے مگر اس جنگ کی تہہ میں اسلام کے سچے اصول کی جاذبیت، اُس کی مساوات و اخوت۔ اُس کی خلق خدا کے ساتھ ہمدردی۔ اُس کی حقوق اللہ و حقوق الناس کی محافظت اور اُس کی انسانیت کی تعمیر میں تمام کوششوں کا نچوڑ اس طرح مضمر ہو کہ اُس جنگ کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں ایسی ہی یا اس سے بہتر تاریخی زندگی حاصل کر لیں جیسی فتوحات ملکی والی لڑائیوں کو حاصل ہے۔

اس واقعہ کے وجود کی وجہ سے تاریخ اسلام میں غیر اقوام کے لیے وہی جاذبیت اور وہی مقناطیسیت پیدا ہو سکے گی جو اصل اصول اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرت زندگی میں موجود تھی اور جس پر فاتحانہ لڑائیوں نے نفرت کے جذبات کا پردہ ڈال کر اقوام عالم کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ واقعہ کربلا بس ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یہ ایک جنگ تھی اور جنگ بھی انوکھی خصوصیتوں اور مخصوص ندرتوں کی حامل جن کی وجہ سے کسی دوسری جنگ سے زیادہ تاریخ اس کو محفوظ رکھنے پر مجبور تھی۔ یہاں بھی کھنچی ہوئی تلواریں تھیں، لچکتے ہوئے نیزے تھے، کڑکتی ہوئی کمانیں اور سنسناتے ہوئے تیر تھے۔ زمین پر بہتا ہوا خون۔ کٹے ہوئے سر اور تڑپتے ہوئے لاشے اور پھر جنگ ایسی جس میں ایک طرف ۳۰ ہزار اور دوسری طرف بہتر

ایک طرف سیر و سیراب اور دوسری طرف تین دن کے بھوکے پیاسے۔ ایک طرف تن و توش والے قد آور جوان اور دوسری طرف
چند جوانوں کے علاوہ اسّی برس کے بڈھے اور کمسن بچے۔ کون سی دنیا کی جنگ ایسی ہوئی ہوگی جس میں قاسم کے ایسے نابالغ
کمسن کا کیا ذکر علی اصغرؑ کا سا شیر خوار بھی قربان ہوا ہو۔
لہٰذا بحیثیت جنگ کے تاریخ مجبور تھی کہ اس واقعہ کے خصوصیات کو محفوظ کرے۔ اب اگر یہ جنگ بھی کھلم کھلا کسی غیر مسلم
جماعت اور دوسری قوم کے مقابلہ میں ہوئی ہوتی تو غیر اقوام کو اُس سے ہمدردی نہ پیدا ہوتی بلکہ وہ اُسے اسلام کی دوسری
لڑائیوں کے ساتھ جو اقوام غیر اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہوئی ہیں منسلک کر کے اُس سے غیریت بلکہ مخاصمت محسوس
کرتیں مگر اس جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ رسمی طور پر کسی ایک مذہب کی حمایت میں دوسرے مذہب کے خلاف نہ تھی
بلکہ ظاہری طور پر ایک ہی مذہب (اسلام) کے پیروؤں میں جو لوگ اُس کے اخلاق اور بلند تعلیمات سے ہٹ گئے
تھے اُن کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اس لیے دنیا کی کسی دوسری قوم کو اُس سے مخاصمت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے
اور اُنھیں اُس کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اُس کے ساتھ اُن سے اسلام کے اعلا اصول اور اخلاقی
حدود کا تعارف ہوتا ہے جو حسینؑ اور یزید کے درمیان خط فاصل بنے ہوئے تھے اور وہ جب حسینیت کی ہمدردی کے
جذبہ کے ساتھ اُن اصول پر غور کرتے ہیں تو اُن کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہوتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا
جو پیغمبر اسلام کے پیش نظر تھا اور جس کی حسینؑ نے اپنے خون سے تکمیل کی۔
یہ ایک بڑی خصوصیت ہے واقعۂ کربلا کی جو اُسے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا مالک بنا دیتی ہے یعنی اگر
تاریخ اسلام سے واقعۂ کربلا کو نکال دیا جائے تو غیر اقوام کی ہمدردی کے لیے کوئی چیز ہمارے پاس نہیں رہ جاتی
اور یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو حسینی واقعات سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔
پھر امام حسینؑ نے اپنے واقعات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو ایسا مدغم کر دیا ہے کہ حسینی تاریخ بغیر ان تعلیمات کے
تذکرہ کے مرتب ہی نہیں ہو سکتی اور اس طرح ان واقعات کے ساتھ وہ تعلیمات بھی قہری طور پر تاریخ کا جزو بن گئے۔
جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے واقعہ کی تاریخی حیثیت ایک مخصوص نوعیت کے ساتھ وابستہ ہے۔
خم شمشیر تاریخ کا جزو بنتا ہے مگر خم محراب نہیں۔ تیروں کی بارش تاریخ کی توجہ مبذول کرتی ہے۔ خوف الٰہی سے
آنسوؤں کی بارش نہیں۔ پھڑکتی ہوئی لاشوں کو تاریخ دیکھتی ہے۔ سجدہ الٰہی میں زمین پر گری ہوئی پیشانیوں کو نہیں
مگر حسینؑ نے کربلا میں یہ کیا کہ تیروں کی بارش میں نماز جماعت ادا کی۔ اب کیا ممکن ہے کہ تاریخ اس نماز کو نظر انداز کر دے
خنجر کی دھار کے نیچے خالق کا سجدہ کیا۔ اب کیا مجال کہ تاریخ اس سجدہ سے آنکھ بند کرے۔
اس طرح امام حسینؑ نے تعلیمات اسلام کو تاریخی زندگی کا لباس پہنا دیا جس کی مثال واقعۂ کربلا کے سوا تاریخ اسلام
کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتی۔

کربلا میں مادیت پرستی اور حق پرستی کا مقابلہ صاف نظر آتا ہے۔ جب میدانِ جنگ میں صفیں مرتب ہوتی ہیں اور
فوج شام کا افسر عمر بن سعد تیر چلۂ کمان میں جوڑ کر حضرت امام حسینؑ کی طرف رہا کرتا ہے۔ پکار کے اپنی فوج کو آواز دیتا
ہے کہ گواہ رہنا، پہلا تیر فوج حسینؑ کی جانب میں لگا رہا ہوں۔ یہاں گواہ کیے جا رہے ہیں فوج کے سپاہی۔ کاہے کے لیے؟
حاکم وقت کے سامنے گواہی دینے کے لیے۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مخلوق کی رضامندی اور مادی فائدہ کا حصول مدنظر
ہے۔ اور ادھر جب حسینؑ کا جوان بیٹا رخصت ہو کے مرنے چلتا ہے، تو زبان پر کیا الفاظ آتے ہیں؟ "خداوندا گواہ رہنا
کہ اب وہ جوان جا رہا ہے جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ کی تصویر ہے۔"

صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف اللہ کی خاطر اور خالق کی رضامندی کے لیے۔

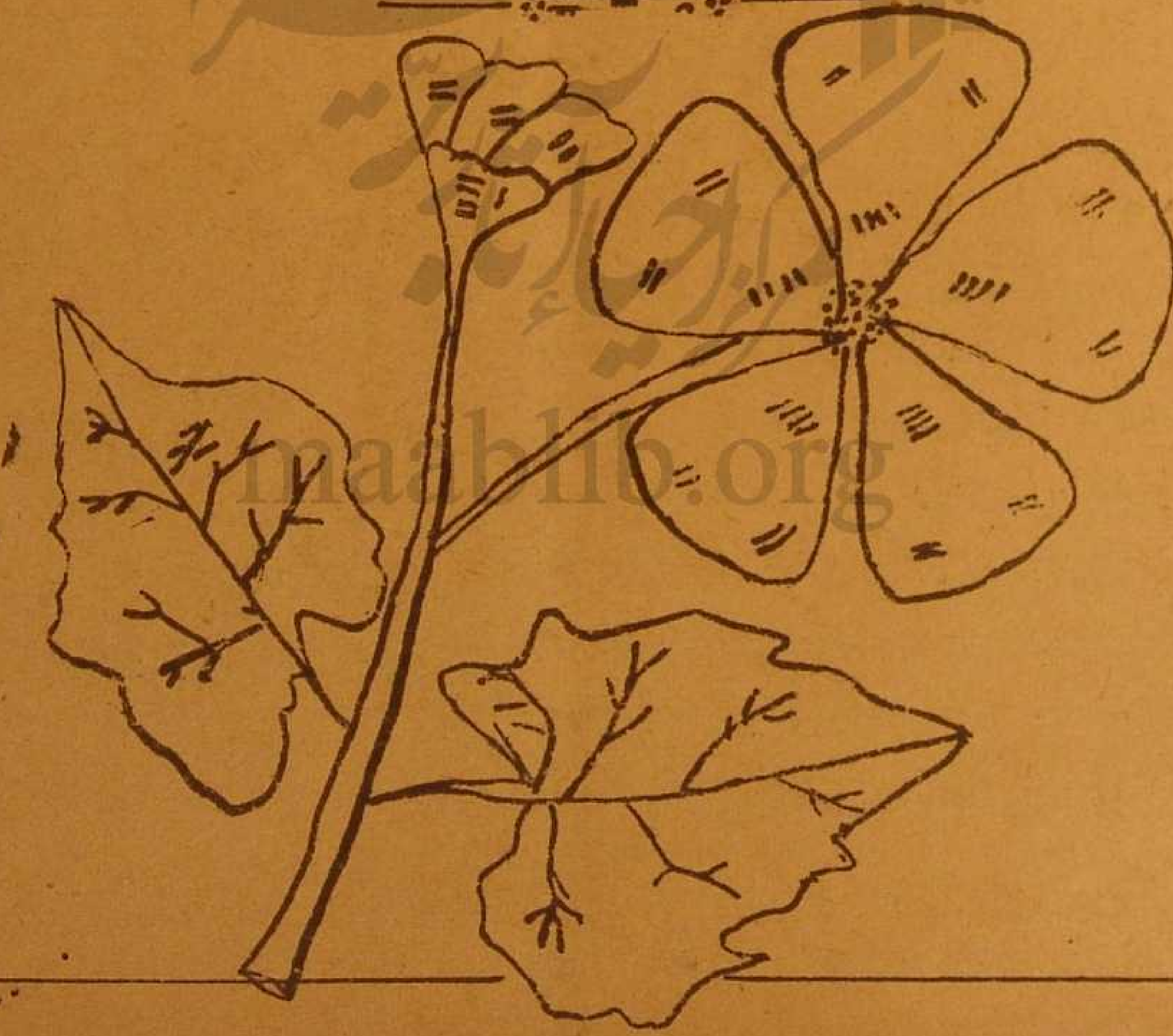
کیا تاریخ کربلا کی جنگ سے اس خدا پرستی کے مظاہرہ کو الگ کر سکتی ہے؟ ناممکن ہے۔

اس سے بڑھکر یہ ہے کہ گھریلو واقعات جن میں قرابتداروں کے باہمی حقوق۔ گھر والوں کے ساتھ برتاؤ۔ باہمی محبت وسلوک کے کتنے ہی تابناک عمل کے جواہرات ہوں مگر تاریخ انھیں مڑ کر نہیں دیکھتی۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں اپنے عزیزوں کو اور اس سے بھی بڑھ کر اہلحرم یعنی بی بیوں اور بچوں کو ساتھ لائے اور اب حسینی کارنامہ کے ذیل میں اعزا کے حقوق قرابتداری، بہن اور بھائی کی غیر معمولی محبت۔ شوہر اور زوجہ کی باہمی وفاداریاں غرض کتنے ایسے زندگی کے پہلو مضمر ہو گئے ہیں جنھیں عموماً تاریخ اپنے دامن میں لیتی ہی نہیں۔

اس کا قطعی ثبوت چاہتے ہوں تو یہ دیکھیے کہ آخر حضرت امام حسینؑ ۱۰ محرم ۶۱ھ کے پہلے بھی تو امام حسینؑ ہی تھے۔ یقیناً آپ کی پوری زندگی ہی حقوق اللہ اور حقوق الناس اور اعزاء کے ساتھ صلۂ رحم اور گھر والوں کے ساتھ مراعات میں ایسی ہی مثالی تھی کہ جیسی وہ کربلا کے میدان میں نظر آتی ہے مگر کیا بات ہے کہ ستاون ۵۷ برس کی عمر میں صرف ایک ہی دن کے جزئیات و واقعات ہیں جو تاریخ کی زبان سے ہم تک پہونچتے ہیں اور اس دن کے پہلے کے ستاون برس کے واقعات ہرگز مسلسل اور مرتب طور پر ہمیں دستیاب نہیں ہوتے۔

اب تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ صرف واقعۂ کربلا کی خصوصیت ہے کہ اس میں رزمیہ کارنامہ کے ساتھ چونکہ زندگی کے دوسرے پہلو منسلک ہو گئے تھے اس لیے انھیں تاریخی زندگی حاصل ہو سکی اور اب آپ کو واقعۂ کربلا کی مخصوص اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی جس نے تمدن اسلامی کے ہر اجتماعی اور انفرادی، معاشرتی اور منزلی پہلو کو اس طرح تاریخ کا جزو بنا دیا جو بغیر اس کے قطعاً ناممکن تھا۔



حضرت امام حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہیں مانا؟

اگر واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد کی وہ معرکہ آرا تقریر جو ۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء صبح ساڑھے دس بجے سے گیارہ بج کر ۵۵ منٹ تک لاہور کے عظیم الشان اجلاس "حسین ڈے" میں ہوئی

سنہ ۱۳۶۱ھ اور کے بین الاقوامی اجتماعات کے بعد جو ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ ہر ہر دیہات میں منعقد ہوئے تھے اور جن میں سے ہر اجتماع میں ہر قوم و مذہب کے افراد ——— شریک ہوتے تھے کم از کم میرے لیے اور میرے اُن رفقائے کار کے لیے جو دہلی یا لکھنؤ سے آئے ہیں یا اُس زمانہ میں وہاں کے باشندہ تھے لاہور کا یہ مظاہرہ حسینیت کوئی حیرت خیز یا غیر معمولی موقع نہیں۔

مگر یاد رکھیے کہ جتنا مرض شدید ہوتا ہے دوا کی تاثیر اُسی قدر زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ سنہ ۱۳۶۱ھ تھا اور آج سنہ ۱۳۷۴ھ ہے اتنی مدت میں حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ اس درمیان میں جو انقلابات زلزلے آندھیاں اور سیلاب آئے انھوں نے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے۔ ان حالات میں یقیناً لاہور کا یہ جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور ایک قسم کا نیا تجربہ ہے جو نوع انسانی کے سامنے پیش ہوا ہے۔

سنہ ۱۳۶۱ھ میں دلوں کے آبگینوں میں بال پڑے تھے مگر اُن کے پرخچے نہ اُڑے تھے اور دل میں خراشیں آئی تھیں مگر ٹکڑے نہ ہوئے تھے ہمارے رجحانات کی سمتیں الگ الگ ہوئی تھیں لیکن جسم جدا جدا نہ ہوئے تھے مگر سنہ ۱۳۷۴ھ میں جب کہ لاہور میں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہوا ہے وہ وقت ہے جب کہ حالات نے ایسا عظیم تفرقہ ڈال دیا کہ ملک کا کیا ذکر گھرانے اور گھر تقسیم ہو گئے۔ اکثر بھائی سے بھائی باپ سے بیٹا شوہر سے بیوی بہن سے بھائی کی جدائی ہو گئی۔ اس دور میں حسینیت کا یہ عجیب تجربہ ہے جو نوع انسانی کے سامنے پیش ہو رہا ہے اور یہ ثابت کر رہا ہے کہ گونا گوں انقلابات کے باوجود جب حسینیت کا پرچم کھل جاتا ہے تو مذاہب کا فرق اور اقوام و ممالک کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جاتے ہیں سنہ ۱۳۶۱ھ سے زیادہ آج کا یہ تجربہ کارگر اور معنیٰ خیز ہے اس لیے کہ اس وقت ہم ایک ایسے نظام کے ماتحت گرفتار تھے کہ تمام عالم میں ہماری آواز اثر نہ رکھتی تھی۔ عالم کی بین الاقوامی مجالس میں آواز بلند کرنے سے ہم گھبراتے بلکہ شرماتے تھے مگر اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تو ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عالم میں اپنے اس پیغام کو پہنچا سکیں۔

آج ہم اپنے ملک میں آزاد ہو چکے ہیں ہر ایک اپنے اپنے وسائل کا خود مالک ہے۔ اقوام عالم میں کم از کم آئینی طور پر دوسروں کے ساتھ عالمی مسائل کے حل کے لیے برابر سے بیٹھ سکتے ہیں بلکہ بعض جگہ ہم ثالث بن کر مسائل کو بھی حل کرتے ہیں۔ اور دنیا ہمارے سامنے اپنے مسائل پیش کرتی ہے تو یہ جلسہ ایک تجربہ گاہ ہے۔ اس کی کامیابی کے بعد میں اس مستقبل کو دیکھتا ہوں جب کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اکابر زعمائے حسینیت کے زیر سایہ عالمی مسائل کو طے کریں اور شاید آگے چل کر وہ حالات پیدا ہوں کہ حسین ڈے کا یہ جلسہ کل عالم کے کسی بڑے مرکز میں منعقد کیا جائے۔ خواہ امریکہ میں خواہ یورپ میں اور خواہ روس وغیرہ میں اور پھر اس حسینیت کے مرکز پر بین الاقوامی دکھ درد کا علاج کیا جائے۔

یاد رکھیے کہ آج کوئی تاجدار و فاتح ملک ایسا تصور نہیں کیا

حسینؑ اور اسلام

وہ تقریر جو شب عاشورائے محرم ۱۳۷۵ھ ریڈیو پاکستان اسٹیشن لاہور سے نشر ہوئی

السلام علیکم — یہ زمانہ وہ ہے جو حسینؑ کے ساتھ خصوصی نسبت رکھتا ہے جس میں گویا ہر در و دیوار سے حسینؑ حسینؑ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس لیے اس وقت "حسینؑ اور اسلام" کے عنوان کے ماتحت اس پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا اسلام سے اور اسلام کا حسینؑ سے کیا خصوصی تعلق ہے اور علاقہ ملکوستان اسلام کے لیے حسینی یادگار کے قیام و دوام کی کیا اہمیت ہے۔

حسینؑ اور اسلام کے باہمی ارتباط کے اظہار کے لیے سب سے پہلے مجھے جو الفاظ ملتے ہیں وہ یہ کہ حسینؑ اور اسلام میں وہ تعلق ہے جو ایک گود میں پلے ہوئے دو بچوں میں ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی گود میں اسلام پروان چڑھ رہا تھا اور اسی گود میں حسینؑ نے پرورش پائی۔ حسینؑ نے آنکھ کھول کر اسلام کو دیکھا اور اسلام نے بڑھ کر حسینؑ کو گلے سے لگا لیا۔ اسی وقت یہ عہد و پیمان ہو گیا کہ جب اسلام پر وقت پڑے گا تو حسینؑ اس کے کام آئیں گے اور پیغمبر اسلام نے اس معاہدہ کی توثیق کر دی۔ اسلام کے اس رقعہ جہاد میں جو مباہلہ کے نام سے مشہور تھا اس کم سنی کے عالم میں حسینؑ کو اپنی گود میں لا کر اور اس طرح گویا اسلام کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں دے دیا کہ دیکھو آج میں موجود ہوں۔ میں ہی اسلام کی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ کل کو جب میں نہ ہوں اور میرے اسلام پر وقت پڑے تو اس کی حفاظت اسلام کے لیے یونہی چل کھڑے ہونا۔ وہ وقت سنہ ۶۰ھ میں آیا اور حسینؑ اسی طرح اسلام کو بچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے جس طرح انھوں نے اپنے جد بزرگوار کو نکلتے دیکھا تھا۔

حسینؑ اور اسلام کے باہمی تعلق کے لیے یہ الفاظ بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ ان میں وہ تعلق ہے جو لفظ اور معنی میں، متن اور شرح میں [illegible] اور اس کی تفسیر میں۔ انسان اور اس کی تصویر میں ہوتا ہے۔

اسلام کچھ عقائد و اعمال کا مجموعہ ہے اور حسینؑ کی پوری زندگی ان عقائد و اعمال کا مجسم نمونہ تھی اور حضرت امام حسینؑ کا بیعت یزید سے انکار بھی اسلام کی تفسیر ہی تھا

اسلام کے دو معنی ہیں۔ ایک خدا کے سامنے سر جھکانا۔ دوسرے اپنے کو اللہ کے بالکل سپرد کر دینا۔
اب جو خدا کے سامنے سر جھکا چکا ہے وہ یزید ایسے شخص کے سامنے سر کہاں جھکا سکتا ہے اور جو

اپنے کو اللہ کے سپرد کیے ہوئے ہو وہ یزید کی بیعت کیونکر کر سکتا ہے؟

اسلام کا خصوصی پیغام بندگانِ الٰہی کو توحید کا پیغام تھا۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے سراپائے وجود سے اظہار و اعلان ہی حقیقتِ اسلام ہے۔ یہ لا الٰہ الا اللہ کا پیغام فقط انھی لات و ہبل کی پرستش روا نہیں کرتا جو پتھروں سے تراشے ہوئے طاقِ کعبہ میں نصب تھے۔ بلکہ یہ پیغام ہر طاغوت باطل کے جلال و جبروت کو ختم کر دینے کا اعلان ہے۔ ہر اس شخص کے اقتدار کو ختم کر دینے کی منادی ہے جو اللہ کے مقابل میں اپنے سامنے بندگانِ الٰہی سے سر جھکانے کا مطالبہ کرتا ہو۔ یزید اپنے وقت میں ایک ایسا ہی طاغوت تھا جو مجسمۂ حق یعنی حسینؑ سے بیعت کا طلبگار تھا اور یہ حسینؑ کا کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے تقاضوں پر سختی سے قیام تھا جو انھوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا۔ اسی لیے تو خواجہ غریب نوازؒ کو کہنا پڑا:

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

اور ڈاکٹر اقبال نے کہا:

سرِّ حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے اسلام کی راہ میں جو قربانی پیش کی وہ اپنی ہمہ گیری کے اعتبار سے تاریخ عالم میں بے نظیر ہے اس لیے کہ راہ حق میں ہمیشہ جو قربانیاں پیش ہوتی رہی ہیں وہ عموماً شخصی اور انفرادی تھیں مگر یہ کربلا کی قربانی ہی کی خصوصیت تھی کہ اس میں امام عالی مقام نے اپنے بھائیوں بھتیجوں بھانجوں یہاں تک کہ اپنے کڑیل جوان علی اکبر اور اپنے شیر خوار علی اصغر ہر ایک کو اپنی آنکھوں کے سامنے بلکہ اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں نثار کر دیا اور اس سے بڑھ کر اپنے اہل حرم کی اسیری تک گوارا کر لی اور اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ اسلام سے کوئی شے عزیز نہیں۔

پھر یہ کہ اس ہنگامۂ مصائب و آلام اور طوفانِ شدائد و مظالم میں شریعت اسلام کی ہر تعلیم کو بھی محفوظ رکھا اور ایسے نازک لمحات میں ان کی مثال پیش کی جن میں عام انسان کے تو ہوش و حواس بھی بجا نہیں رہ سکتے۔ ایک طرف خالق کی نماز بجماعت ادا کی اس وقت جب تیروں کی بارش ہو رہی تھی مگر دو فداکار سعید بن عبد اللہ حنفی اور زہیر بن قین سامنے کھڑے کر دیے کہ وہ تیروں کو اپنے اوپر روکیں۔ ادھر امام نے سلام پھیرا اور ادھر سعید زخموں سے چور زمین پر گرے اور امام سے مخاطب ہو کر پوچھا اوفیت یا ابا عبد اللہ کیوں مولا میں نے حق وفا ادا کیا؟ امام نے فرمایا نعم وفیت جزاک اللہ خیرا ہاں ہاں تم نے حق وفا ادا کر دیا۔ اللہ تمھیں جزائے خیر عطا کرے۔

دوسری طرف حقوق العباد جن کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے انھیں بھی سخت سے سخت اوقات میں حضرت امام حسینؑ نے ادا کیا۔ کربلا کے راستے میں فوج حر کو پانی پلایا گیا تھا۔ حالانکہ وہ دشمنوں کی فوج تھی مگر چونکہ پیاسی تھی رحمۃ للعالمین کے جانشین سے دیکھا نہ گیا۔ حالانکہ اپنے ساتھ اہل حرم اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور عرب کے بے آب و گیاہ صحرا کا مستقبل آگے تھا مگر آپ نے اپنے ساتھ کا جتنا پانی تھا وہ اس

فوج کو پلوا دیا یہاں تک کہ اُن کے گھوڑوں تک کو سیراب کر دیا۔

روزِ عاشور جبکہ جدال و قتال کا بازار گرم تھا۔ تین دن کی بھوک پیاس تھی اور عرب کے صحرا کی دھوپ سر پر تھی ـــ اُس وقت اپنے ساتھ والوں کے ساتھ وہ مساویانہ سلوک کہ خیمہ گاہ سے ہو کر جنگ میں جا کر ایک ساتھی کے گھوڑے سے گرنے پر امام سرہانے پہنچتے تھے اور لاش اٹھوا کر خیمہ گاہ کی طرف لے جاتے تھے۔

وہ اسلامی مساوات کی ہمہ گیری جس میں غلاموں تک سے عزیزوں کا برتاؤ کیا جاتا ہے کربلا میں اپنی پوری شان کے ساتھ برتی گئی۔ واضح غلام ترکی اور جون غلام حبشی کے ساتھ اُس برتاؤ سے جو امام نے کیا بلکہ غلام کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ دوسرے اصحاب اور اپنے اعزاء کے ساتھ نہ کیا کہ جب وہ زخمی ہو کر گرا اور اُس کی آواز پر امام تشریف لے گئے تو آپ اُس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اپنا مقدس رخسار اُس کے رخسار پر رکھ دیا اور اسی طرح رہنے دیا یہاں تک کہ اسی عالم میں اُس کی روح نے جسد سے مفارقت کی ـــ اور اسی مساوات کو اُس سے زیادہ سخت موقع پر اُس وقت نباہا جب اصحاب کی شہادت کے بعد بلکہ اعزاء کے داغ اُٹھا چکے تھے بلکہ اُس وقت جب علی اکبر کو دم توڑتے دیکھ چکے تھے۔ جب عباس کمر شکستہ کر چکے تھے بلکہ اُس عالم میں جب ابھی ابھی اپنی تلوار سے قبر کھود کر اپنے ہاتھوں سے چھ مہینے کے شیرخوار علی اصغر کو دفن کر چکے تھے ـــ اس وقت جب رخصت آخر کے لیے در خیمہ پر آئے اور بلند آواز سے کہا، السلام علیک یا زینب السلام علیک یا ام کلثوم السلام علیک یا لیلیٰ و رباب السلام علیک یا سکینہ و رقیہ و ان الخلوق۔ بی بیوں اور بیٹیوں کے سلام کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ السلام علیک یا فضہ جاریۃ امی فاطمۃ الزہراء۔ "سلام ہو فضہ پر جو میری ماں فاطمہ زہرا کی کنیز ہے"۔

اس طرح حسینی کردار میں تعلیماتِ اسلامیہ اس صورت پر منسلک ہو گئی ہیں کہ حسینی یادگار کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی یاد بھی تازہ ہوتی رہتی ہے ـــ اس طرح حسینؑ اور اسلام دونوں ہی ایک ساتھ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے ـــ

کے لیے حرام کہاں ہو سکتا تھا جب اُن کو وقت کی حرمت کا خیال نہ تھا تو جگہ کا احترام کہاں کرتے۔

آج دنیاوی سیاست کی نظر سے اس امر کو جانچیے کہ اگر کہیں مکہ میں طواف یا سعی کی حالت میں یا نماز میں کوئی شخص آکر شہید کر دیتا تو فرزند رسولؐ شہید ہو جاتے لیکن آج تک دنیا کو یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ قاتل کون ہے صفحات تاریخ پر آج یہ معاملہ صاف ہے کہ حضرت امام حسینؑ بالکل بے جرم تھے اور اُن کا قاتل یزید تھا لیکن اگر فرزند رسولؐ اس صورت میں شہید ہو جاتے تو قاتل امام پوشیدہ ہو کر زندہ رہتا البتہ امام حقیقی معنوں میں قتل ہو جاتے اور آپ کا مقصد بھی آپ کے ساتھ ہی قتل ہو جاتا۔

کیا مشیران امام اتنے دور رس تھے جو ان تاریخ کو مد نظر رکھ کر مشورہ دیتے؟ ان میں کچھ واقعی ہمدرد تھے اور کچھ شائستہ طور پر خیر خواہ تھے جو سیاست کے ماتحت ہمدرد بن رہے تھے مگر سب کے مشورے صرف وقتی حالات کی بنا پر جذبات سے متاثر ہو کر دیے گئے تھے۔ مگر امام حسین علیہ السلام جذبات سے بلند تر تھے کیونکہ جذبات سے بلند ہستی کا نام ہی معصوم ہے۔ اور انھوں نے مشوروں کی مخالفت کر کے اپنا جذبات سے بلند ہونا دکھا دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ جذبات سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ کربلا کا واقعہ اس قدر اہمیت کیوں رکھتا ہے یا اس کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ مگر اب جب کہ واقعۂ کربلا ہو چکا میں کیا بتاؤں کہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا جس نے تاریکی دیکھی نہ ہو اور دن ہی کو آنکھ کھولی ہو وہ پوچھے کہ سورج نہ ہوتا تو کیا ہوتا تو اُسے کس طرح بتایا جا سکتا ہے۔

امام نے جو قربانی پیش کی ہم نے اس کی برکات کے زیر سایہ آنکھ کھولی ہے آپ نے حقانیت کا ایسا سورج چمکایا جو کبھی غروب ہونے والا نہیں لہٰذا اب کوئی کیا سمجھے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ خدا نہ ہوتا کیا ہوتا ظاہر ہے کہ خدا نہ ہونے کا تجربہ ہی کسی کو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا ازل سے ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو یہ جو کچھ ہے کچھ بھی نہ ہوتا ہماری دینی زندگی جس کو دوسری لفظوں میں انسانی زندگی کہوں گا۔ اور شریفانہ باشعور باعزت اور خود دار زندگی اس سب کا کچھ پتہ نہ ہوتا۔ اذانیں نہ ہوتیں۔ اقامت نہ ہوتی۔ نماز نہ ہوتی روزہ نہ ہوتا حج نہ ہوتا قرآن نہ ہوتا اخلاق نہ ہوتا احساس نہ ہوتا تمدن نہ ہوتا تہذیب نہ ہوتی مساوات و اخوت نہ ہوتی۔ حریت نہ ہوتی جذبہ شہادت نہ ہوتا حقانیت نہ ہوتی اور حق پرستی نہ ہوتی اب اس کے بعد میں کیا بتاؤں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا مگر ابھی تک تو یہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے اس کے ثبوت کے لیے میں کہوں گا یہ دیکھیے کہ واقعہ کربلا نہ ہوا تھا تو کیا ہو رہا تھا اور خدا کی قسم جو ہو رہا تھا وہ ایسا ہے کہ اب یقین مشکل سے آتا ہے کہ یہ ہو رہا تھا۔

جس پیغمبر نے یہ نمونہ پیش کیا ہو کہ دین و دنیا کا اقتدار زیر قدم رکھتے ہوئے کئی کئی وقت پیٹ پر پتھر باندھا اور کھانا نہ کھایا ہو اور جس پیغمبر نے ہمیں یہ نمونہ دکھایا ہو کہ وہ معزز بیٹی جس کی تعظیم کو آپ کھڑے ہو جاتے ہوں۔ یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنی جگہ تو اُن کا یہ اعزاز مگر جب اُنھیں کنیز سپرد فرماتے ہیں تو کنیز کے ساتھ مساوات کا اتنا خیال فرماتے ہیں کہ بیٹی گھر کا سارا کام کاج فضہ پر نہ ڈالنا بلکہ ایک دن گھر کا کام خود کرنا اور ایک دن فضہ سے لینا چنانچہ بیٹی نے ایسا ہی کر کے دکھایا کہ ایک دن فضہ لونڈی کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی اور حضرت فاطمہ آرام فرماتیں اور دوسرے روز حضرت فاطمہ گھر کا کام کرتیں اور فضہ آرام کرتیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو معیار غلامی اپنی جگہ ہی رہتا آلِ رسولؐ نے بتایا کہ یہ تو باہمی تعاون کے ذریعے ہیں۔ آقا غلام خاوند بیوی وغیرہ۔ یہ رشتے گھر کے افراد میں شمولی کا ذریعہ ہیں۔ ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے آج جب چھوٹے بھائی سے یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ کہتے ہیں "سگ باش برادر خورد مباش" تو ہمارے اس تمدن میں غلام کنیز کے ساتھ اچھا برتاؤ کہاں ہوگا۔ مگر یہ قصور ہمارے تمدن کا ہے آلِ محمدؐ کے غلاموں اور کنیزوں سے پوچھو کہ تم کو آزاد ہونا منظور ہے یا غلام رہنا۔ آج کی آزادی کا ہزار غلامی سے بدتر اور وہ غلامی رشک تاجداری تھی وہ فاطمہ زہرا کا حسب ہدایت پیغمبر برتاؤ اپنی کنیز فضہ کے ساتھ اور اسی طرح حضرت علیؑ کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ اس وقت نہیں جب کہ آپ خانہ نشین تھے بلکہ اس وقت جب کہ آپ شہنشاہ تسلیم کیے جا رہے تھے ایسے وقت قنبر کے

جا سکتا جس کا نام اقوام عالم کو گلے ملا دے چاہے وہ کتنے ہی جاہ و جلال کا مالک ہو مگر کربلا کے تڑپتے ہوئے لاشے بہتا ہوا خون اور نیزوں پر بلند ہونے والے سر آج دنیا کو ایک موقف پر لا سکتے ہیں سمجھے آپ نظام اہلبیت ؟

دنیا نے فتح ممالک کو کامیابی کی دلیل سمجھا لیکن اہلبیت نے فتح قلوب کو اصل فتح کی دلیل سمجھا۔ فاتحین ممالک ختم ہو گئے لیکن فاتحین قلوب ابھی طرح زندہ ہیں۔

یاد رکھیے کہ یہ فتح کا راز وہ تھا جسے حسینؑ کے مشیر کار سمجھے ہوئے نہ تھے لیکن حضرت امام حسینؑ اس راز سے واقف تھے۔ مشیروں نے حضرت امام حسینؑ کو رائے دی کہ آپ کربلا نہ جائیے مگر امام نے مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا یہ برا کیا؟ پیغمبر اسلام نے اپنے مشیروں کا کہنا کب مانا تھا۔ کسی اور کا کیا ذکر۔ سگے چچا کا کہنا نہ مانا۔

یہ مشیران امام مادی مستقبل سامنے رکھتے تھے اور آج کے مشیروں کا حوالہ دینے والے بھی یہی دماغ رکھتے ہیں بیشک وہ مجرد نگاہ کی رو سے مر گئے، مٹ گئے، برباد ہو گئے۔ گود کے بچے تک شہید ہو گئے عورتیں اسیر ہو گئیں یہ سب مشیروں کا کہنا نہ مان کر ہوا مگر پیغمبر اسلام نے بھی تو مشیروں کا کہنا نہ مان کر دکھ ہی اٹھائے

یہ نہ دیکھیے کہ ۱۳ تیرہ برس کے بعد ہجرت ہوئی اور انصار ملے لیکن ہجرت سے پہلے ۱۳ برس رسول خداؐ نے کیا کیا۔ دکھ نہیں سہے؟ جسم مبارک پر پتھر نہیں کھائے سر مبارک پر خس و خاشاک نہیں پھینکا گیا؟ یہ سب کچھ ہوا۔ شعب ابی طالب میں ۳ برس مقید رہے یہ زمانہ اتنا شدائد سے بھرا ہوا تھا کہ کئی کئی وقت نہ کھانا ملتا نہ پانی۔ اکثر درختوں کے پتے کھا کھا کر گزر کی جاتی تھی۔ انہی تکالیف کا اثر تھا کہ محاصرہ سے باہر آنے کے بعد چند ہی ماہ کے اندر حضرت خدیجہ اور ابو طالب دونوں کی وفات ہو گئی جس کی بنا پر رسول خداؐ نے اس سال کا نام عام الحزن رکھ دیا یہ سب کچھ کہنا نہ ماننے ہی کا نتیجہ تو ہوا۔

اب دنیا بتائے کہ انھوں نے اچھا کیا یا برا کیا اور اس کا کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ پھر اگر پیغمبر اسلام کا مشیروں کے مشوروں کو رد کر دینا درست تھا تو حضرت امام حسینؑ نے بھی اگر مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا برا کیا؟

کتب تواریخ میں مشیروں کا ذکر بہت ہے مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ بات نہ ملے گی کہ کسی مشیر نے یہ رائے دی ہو کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔ مشورے اس طرح کے تھے کہ عراق نہ جائیے۔ طائف تشریف لے جائیے۔ یمن چلے جائیے۔ مکہ معظمہ میں قیام کیجئے لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ یزید کی بیعت کرنا امام حسینؑ کے لیے سب ہی کے نزدیک ناممکن یا ناروا بات تھی۔ اب بیعت نہ کرنے کے بعد جن جگہوں کے متعلق مشورہ دیا جا رہا تھا ان میں سے کوئی بھی کیا ایسی تھی جو مملکت یزید کے حدود سے باہر ہو۔ لہذا نتیجہ یہی تھا کہ یزید کی طرف سے فوج کشی ہو۔ پنڈت دیاس دیو مصرا کا وہ فقرہ کس قدر پسندیدہ ہے جو آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ اب سوال فقط مقتل کے انتخاب کا تھا۔ شہادت امام حسین علیہ السلام تو یقینی تھی ہی اگر مدینہ میں رہتے تو اسی طرح ہوتا جیسا حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ اسی طرح مکہ میں ہوتے تو بھی کسی خفیہ طریقے سے خاتمہ کر دیا جاتا۔

امام حسینؑ کا مکہ چھوڑنا کن حالات میں تھا اس کو یوں سمجھیے کہ جو چیز فطرت کے خلاف عمل ہو اسے ضرور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ماننا پڑے گا۔ وہ حسینؑ جو ۲۵ حج پا پیادہ کر چکے ہوں، اور حج کے اس قدر مشتاق ہوں کہ مدینہ سے آ آ کر حج کرتے ہوں اس طرح کہ مرکب ساتھ خالی جا رہے ہوں اور آپ پیروں پر جا رہے ہوں کیا اتنے ذوق عبادت رکھنے والے حسینؑ کو کیا آج وہ رابطہ نہ تھا جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے ہوتا ہے؟ ان کا تعلق کعبہ کے ساتھ مذہبی تعلق کے علاوہ خاندانی تعلق بھی تھا وہ ان کے باپ کا مولد بھی تھا۔ پھر خیال تو کیجیے کہ پیغمبر اسلام کا نواسہ اور ایک دن حج کا باقی رہتے ہوئے وہاں سے سفر کر رہا ہے جب کہ تمام مسلمان مکہ کی طرف حج کرنے جا رہے ہیں وہ وہاں سے مکہ چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور راہ میں قافلے والے حیرت سے پوچھتے ہیں کہ امام اس وقت کدھر جا رہے ہیں۔ اور ہر شخص کا سوال فرزند رسولؐ کے دل پر نشتر کا کام کر رہا ہے۔ ہر ایک سے کہاں اصلی بات بتاتے۔ کسی کسی سے کہہ بھی دیا کہ اگر میں نکل کھڑا ہوتا تو قتل ہو جاتا یا گرفتار ہو جاتا (واللہ لو لم اخرج لاخذت) اس لیے کہ حاجیوں کے بھیس میں سپاہی بھیجے گئے تھے کہ جب اور جہاں امام ملیں انھیں شہید کر دیا جائے۔

ان ظالموں کے لیے جب وہ شہر الحرام حرام نہ تھے تو بلد الحرام ان

ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں اور دروازوں کے اوپر پہرے لگے ہوں تاکہ کسی غریب کی رسائی نہ ہو سکے اور کسی مظلوم کی فریاد اس کے کانوں میں پہنچنا ممکن ہو جائے یہی نہیں بلکہ بادشاہ کے سامنے طلا و نقرہ کے برتنوں میں پانی پلایا جا رہا ہو۔

یہ سب باتیں یزید سے پہلے ہو چکی تھیں اور اگر کوئی صحابی مثلاً عبادہ بن صامت وغیرہ ٹوکتے بھی تھے تو ان کو قدامت پسند ہونے کی سند ملتی تھی یاد رکھیے یہی حالات ترقی کر کے یزید کے کردار کے درجہ تک پہونچے یزید سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں میں پانی پیا گیا جو ظرف کے اعتبار سے شرع اسلامی میں حرام ہے تو یزید کے یہاں شیشوں کے جاموں میں شراب پی جانے لگی اور شراب کے دور چلنے لگے اب بجائے صدائے تکبیر کے نائے و نوش کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں رنگ برنگ کی محفلوں میں نماز کا وقت آکر گزر جاتا لیکن رونق محفل میں کچھ فرق نہ آتا۔

غضب یہ ہے کہ یہ سب کچھ جانشینی رسولؐ کے نام پر ہو رہا ہے اور سب مسلمان درباری وغیرہ مان رہے ہوں اور یہ ہونا اتنا حیرتناک نہیں جتنا کہ عام طور پر مسلمانوں کا ماننا یعنی یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور مسلمان اس حاکم کو خلیفۂ رسول مان رہے ہوں۔ آج کا مسلمان ضرور حیرت سے یہ پوچھے گا کہ کیا مسلمان اس کو مان رہے تھے۔

جی ہاں سب مان رہے تھے اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ شمار کر کے کیوں بتاتی کہ فلاں فلاں نے نہیں مانا۔ تاریخ کا شمار کرنا بتا رہا ہے کہ اور سب مان رہے تھے۔ وفات پیغمبر کے پچاس برس کے بعد ہی یہ احساس مذہبی کا حال ہو چکا تھا اور ۱۱ھ سے اب تک تیرہ سو تیرہ برس ہو چکے ہیں مگر جب کہ عموماً احساس کیا جاتا ہے کہ اسلام گھٹتا چلا جا رہا ہے اور تمدن و تہذیب کی حدیں پامال ہو رہی ہیں گزشتہ ۶۱ھ کے مقابل میں اس وقت بھی حالت بہتر ہے اور یہ مجمع کم نہیں ہے میں اسی جلسہ کے مجمع سے شہر اور دیہات سے آئے ہوئے تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی یزید ایسے شخص کو جانشین رسول مان سکتا ہے؟

آج کے جاہل سے جاہل اور فاسق و فاجر مسلمان سے بھی پوچھا جائے تو یزید ایسے کسی آدمی کو جانشین رسولؐ نہ مانے گا۔ لیکن رسول خدا کی وفات کے صرف پچاس برس کے بعد لوگ مان رہے تھے کیا اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ واقعہ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

(چاروں طرف سے نعروں کی صدا بلند ہوئی)

ظلم اور فسق و فجور سے یہ نفرت کیونکہ پیدا ہوئی۔ یہ واقعہ کربلا کا فیض ہے آج کا یہ جلسہ اور اس طرح کی تمام یادگاریں اسی اثر کو زندہ رکھنے کے لیے ہیں۔ اسی کے لیے عزاداری ہوتی ہے اور اسی کے لیے نام حسینؑ کی یہ تکرار کی جاتی ہے۔

اب بھی سوال ہوگا کہ حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا اور یہ کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو کیا ہرج تھا۔ میں کہوں گا کہ وہ حسینؑ نہ ہوتے جو مان لیتے کوئی اور ہوتا۔ حسینؑ تو کبھی پشیمان نہیں ہوئے کہ مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا حسینؑ کے ساتھ والا بھی کوئی پشیمان نہ ہوا۔ کوئی بچہ حسینؑ کے ساتھ کا نادم نہ ہوا۔ اور اُدھر کوئی اور کیا خود یزید ملعون نادم ہوا مگر یاد رکھیے اس فرق کو کہ وہ ندامت زندگی ضمیر کا نتیجہ نہ تھی جسے توبہ سمجھا جا سکے بلکہ وہ احساس شکست کا نتیجہ تھی اب اس خیال سے کہ میرے بعد والے مقررین پر ظلم ہوگا اور مجھے خود جلسہ کے مفاد کا بھی احساس ہے اس لیے اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے جس طرح آج کے جلسہ میں اجسام یکجا ہوئے ہیں اسی طرح ہمارے دل و دماغ بھی یکجا ہو جائیں اور حسینیت کا جھنڈا خدا کرے برابر لہراتا رہے اور مشرق سے مغرب تک کو اپنے سائے میں لے لے۔



ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھلایا کہ بازار سے دو پیراہن خریدے ایک سات درہم کا دوسرا پانچ درہم کا، پہلا پیراہن اپنے غلام قنبر کو حضرت نے عطا فرمایا اور پانچ درہم والا خود زیب تن کیا۔ قنبر عرض کرتے ہیں کہ حضور یہ کچھ بہتر ہے آپ اسے زیب تن فرمائیے۔ ہم میں سے آج کا کوئی آدمی اوّل تو ایسا کرتا ہی کیوں۔ اگر کوئی لیڈر قسم کا آدمی ایسا کر بھی دیتا تو جب قنبر نے عرض کیا تھا کہ حضور یہ بہتر ہے آپ پہن لیں تو وہ فوراً اپنی مصلحانہ حیثیت کا علم اونچا کر دیتا وہ جواب میں ایک تقریر کر دیتا کہ قنبر میں دنیا سے اس تفرقہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں دنیا میں غلاموں کا معیار بلند کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ

لیکن حضرت علیؑ نے یہ جواب نہیں دیا حالانکہ پیش نظر یہی تھا لیکن قنبر سے اگر یہ فرماتے تو اس جواب میں خود عدم مساوات مضمر تھی اس ارشاد سے قنبر کو احساس غلامی پیدا ہو جاتا۔ آپ قنبر کو ایسا جواب دیتے ہیں جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے کہ تم جوان ہو تمھیں یہ پیراہن اچھا لگتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ خود جس طرح کی تربیت مسلمانوں کی کرنا چاہتے تھے وہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس صف میں ایک رئیس خالی جگہ پا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک غریب بوسیدہ کپڑوں والا جو آداب نبوی کا عادی ہے آ کر اس رئیس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے رئیس صاحب نے اپنے معیار طبیعت کے لحاظ سے بہت اخلاق سے کام لیا بہت ضبط سے کام لیا اپنا دربار ہوتا تو شاید یہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے اور بدتمیز کہتے۔

مگر وہ بارگاہ پیغمبر تھی یہاں یہ ممکن نہ تھا پھر بھی فطری طور پر ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح ہو گیا کہ رئیس نے اپنا لباس سمیٹ لیا۔ پیغمبر اسلام نے اتنا بھی گوارا نہ کیا اور خلق عظیم کی تیوریوں پر بل آ گئے اور فرمایا "یہ تم نے کیا کیا؟" کیا اس کی غربت تم میں آ جاتی یا تمھاری ریاست اس کو مل جاتی یا چلی جاتی دامن کیوں سمیٹا؟)

مربّی اعظم کی اس تنبیہ کا اتنا اثر ہوا کہ وقتی طور پر اس کا ضمیر شرمندہ ہوا۔ اور عرض کی یا رسول اللہ اس گناہ کے کفارہ میں میں اپنی نصف دولت اس غریب بھائی کو دیتا ہوں۔ متبسم ہوتے ہوئے حضور غریب کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ نصف دولت کی پیشکش تم کو منظور ہے؟ غریب صحابی نے جواب میں عرض کیا کہ میں اسے شکریہ کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ یہ خوشی سے دے رہا ہے اس نے عرض کیا مجھے ڈر ہے کہ یہ ذہنیت کہیں مجھ میں نہ پیدا ہو جائے

محض اخلاق کی کتابوں میں نمائشی طور پر اصول کو درج کر دینا آسان بات ہے لیکن جیتی جاگتی عمل کی دنیا میں اتنی کم مدت میں اس کو پیش کر دینا یہ بڑی مشکل بات ہے پیغمبر خداؐ نے ہر تعلیم کو عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے زندہ مجسمے کی شکل میں پیش کر دیا کہ میرا نظام فقط ذہنی یا دماغی نہیں بلکہ عملی ہے وہ زندہ نظام ہے جو سیرت و کردار کی شکل میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ میرا آئین اخلاق لفظی نہیں بلکہ بالکل عملی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اہلبیتؑ کی ضرورت ہوئی اور ارشاد ہوا انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اور اسی لیے ان اہلبیتؑ کو مباہلہ کے میدان میں اپنے ساتھ لے گئے تھے

میرا عقیدہ ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے کہ دعائے رسولؐ کسی کی آمین کی محتاج نہ تھی بلکہ ان میں سے ہر فرد کی دعا تنہا کافی تھی، مگر خالق اکبر نے نبی علیہ السلام کو یہ آیت فرمائی کہ ان سب کو ساتھ لے جاؤ منزل مباہلہ میں۔

اس لیے کہ جب صادقین اور کاذبین میں مقابلہ ہو رہا ہے تو دنیا جان لے کہ خالص صادقین افراد یہ ہیں اور جب رسالتمآبؐ دنیا سے اٹھ جائیں تو جو کام آپ کے بعد ان سے لیا جانا ہے وہ زندگی ہی میں ان سے لے لیا جائے۔ اس لیے نصرت اسلام کے لیے آج ان کو ساتھ لیا اور شریک کار بنایا۔ مباہلہ کے اس شریک کار ہونے میں سب سے کمسن حسینؑ تھے اور ان کو رسولؐ خود اپنی گود میں لے گئے تھے۔ پیغمبر خدا کی نگاہ ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی تھی کہ اسی حسینؑ کی قربانی کی دنیا کو ضرورت پیش آئے گی، چنانچہ ۶۱ھ میں وہ پیش آ گئی یہ اہلبیتؑ دنیا میں اسی لیے چھوڑے گئے تھے اور ان کا تعارف مسلمانوں سے اسی لیے کرایا گیا تھا کہ یہ اسلامی نظام تمدن کی زندہ تصویر تھے کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ جن مسلمانوں کی تربیت اس معیار پر کی جا رہی ہو۔ ان مسلمانوں میں صرف پچاس برس کے بعد ہی یہ وقت آ گیا کہ دار[illegible] اسلامی میں ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں اور غلام زریں کمر بند لگائے

اب اس معیار پر حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادت کو دیکھیے تو یقین ماننا پڑےگا کہ یہ ایک شہادت مجموعہ تھی اُن تمام شہادتوں کا جو ازل سے کبھی بھی راہ خدا میں پیش کی گئی ہوں۔

اب اس کے فلسفہ کے لیے کسی مزید تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی کبھی کسی شہادت کا فلسفہ رہا ہے وہ اس شہادت کا فلسفہ بھی تھا۔

جس لیے زکریا نے آرے سے چرا جانا منظور کیا۔ جس لیے جرجیس تیل کے کڑھاؤ میں ڈال کر ابال ڈالے گئے۔ جس لیے یحییٰ کا سر قلم ہوا۔ جس لیے حضرت موسیٰ نے طرح طرح کے شدائد جھیلے جس لیے حضرت عیسیٰ نے یہود کے ہاتھوں طرح طرح کی تکالیف اٹھائے اور آخر میں جس لیے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تیرہ برس تک اپنے جسم مبارک پر پتھر کھائے۔ پتھر جس لیے عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب نے زخمی ہو کر دم توڑا۔ حمزہ بن عبدالمطلب کا جگر چاک ہوا۔ جعفر طیار کے ہاتھ قلم ہوئے۔ غرض بدر و احد اور دیگر غزوات میں کتنے شہداء خاک و خون میں لوٹے۔ بس اُسی لیے آج فرزند رسول الثقلین حضرت امام حسینؑ میدان قربانی میں گامزن ہوئے۔

شہادت کی حقیقت ایک ہی ہے مگر [illegible] جتنی ذوق تعمیر کم یا جتنے حق پر سر دست [illegible] ہوں اُتنا شہادت حق کی آواز کو بلند تر ہونا چاہیے اور جتنے باطل کی طرف لے جانے والے اسباب زیادہ جمع ہوں اُتنی ہی عظمت حق کی شہادت طاقتور ہونے کی ضرورت پڑے گی۔

اس کے پہلے جتنے انبیاء اور مصلحین نے قربانیاں پیش کی تھیں وہ ایسے افراد کے مقابلہ میں جو حق سے کھلے ہوئے مخالف تھے جیسے موسیٰ کے مقابلہ میں فرعون اور حضرت ابراہیم کے مقابلہ میں نمرود جو کھلم کھلا اپنی خدائی کا اعلان کرتا تھا۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں ابو جہل و ابو لہب جو علانیہ توحید کے منکر اور بت پرستی کے علمبردار تھے مگر حضرت امام حسینؑ کو جس جماعت کے مقابلہ میں قربانی پیش کرنی تھی وہ ایسی جماعت تھی جو ظاہراً اسی راستے کی سالک تھی جس کے حضرت امام حسینؑ رہبر تھے۔ وہ اسلام [illegible] اسلام سے انحراف کا اظہار نہیں کرتے تھے وہ انہی پیغمبر اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے جن کے حسینؑ نواسے تھے اور یزید اُسی اسلام کے نام پر حکومت کر رہا تھا جس کی حفاظت امام حسینؑ کو منظور تھی۔ اس لیے حضرت امام حسینؑ کی مہم بہت مشکل تر ہو گئی تھی۔

اگر کوئی غیر شعائر اسلامیہ کو کچھ بھی صدمہ پہنچانا چاہے تو مسلمان بہت جلدی بیدار ہو جاتے اور دشمنی میں آ جاتے ہیں لیکن جب اسلام کے نام پر خود [illegible] اسلام کو نقصان پہنچایا جائے تو مسلمانوں کی آنکھ بڑی مشکل سے کھلتی ہے۔

امام حسینؑ کے سامنے یہی صورت حال تھی۔ یزید تخت اسلام پر خلیفۃ المسلمین بنا ہوا بیٹھا تھا۔ یقیناً پیغمبر خدا ص کے بعد مسلمانوں کے سامنے اگر کوئی یزیدی مجسمہ آ جاتا تو بھی وہ بہت جلد چونک پڑتے مگر یہ منزل رسول اسلام کے بعد پچاس برس میں تدریجی طور پر آئی تھی۔ اس طرح مسلمانوں کے احساسات پر بے ہوشی چھا گئی تھی اور ایک غشی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔

فلسفۂ شہادت حسینؑ

شب عاشور سنہ ۱۳۷ھ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔

"شہادت" کے معنی ہیں گواہی اور گواہی کا مفہوم ہے "اثباتِ حقیقت" اور اثبات کی ضرورت اسی حقیقت کے لیے ہوتی ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہو لہٰذا جتنی کوئی حقیقت عظیم ہو اور جتنی زیادہ آنکھوں سے پنہاں ہو اتنی ہی مہتم بالشان گواہی کی اُسے ضرورت ہوگی اور سب سے مہتم بالشان وہ گواہی ہے جو اپنے خون کی مہر ثبت کر کے ادا کی جائے اور سب سے زیادہ آنکھوں سے مخفی حقیقت ازلی اور ذات ربانی ہے۔ اسی لیے اُس جان کی قربانی کو جو راہ خدا میں جہاد کر کے پیش کی جائے اسلام میں "شہادت" کہا جاتا ہے۔

حق اور باطل میں جنگ ہمیشہ سے قائم رہی ہے۔ باطل کے محرکات عموماً عالم مشاہدات کے مادی اسباب ہوتے ہیں۔ کوئی حسن نظر فریب، کوئی شمشیر زہرہ گداز۔ کوئی تاج و تخت، کوئی ثروت و دولت۔ کوئی جاہ و حشم یا کوئی نمرود، کوئی فرعون اور کوئی یزید۔ — ان کی تحریک کی پوری طاقت احساسات پر چھا کر دل کو متاثر کرنے میں مضمر ہے۔ اس کے برخلاف حق اپنے لیے نہ کوئی صورت دل فریب رکھتا ہے جو جنت نگاہ بن سکے۔ نہ صدائے سامعہ نواز جو فردوس گوش ہو۔ نہ کوئی گنج شائگان ہوتا ہے جو نظر کو لبھائے۔ نہ کوئی تیغ براں جو دل کو دہلائے۔ نہ کوئی زر و گوہر۔ نہ کوئی لاؤ لشکر۔ اس کی کشش تو صرف ایک غیبی طاقت کے احساس پر مبنی ہے جو نظروں سے بالکل مخفی ہے مگر حق پرست افراد اس حق کے مقابلہ میں ہر قسم کے نقد فائدہ اور حاضر مفاد کو ٹھکرا کر اُس حق کی طاقت کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔

اگر ہم اصطلاحات کی الجھنوں میں نہ پڑیں اور صرف حقیقت پر نظر رکھیں تو ہر وہ تکلیف جو حق کی راہ میں کبھی اٹھائی گئی ہو ایک درجہ کی شہادت ہے جو اس حق کے لیے پیش کی گئی اور اس طرح مردان راہ خدا کی ہر تکلیف جو وہ آلام و مصائب کو اُٹھاتے ہوئے لیتے ہیں ایک شہادت ہے۔ اسی لحاظ سے شہادت کے بے شمار درجے ہوتے ہیں جن میں اہمیت و عظمت کبھی دشمن کی شدت و کثرت کے ساتھ پیدا ہوگی اور کبھی اس لحاظ سے کہ باطل کے کتنے قوی محرکات کے مقابلہ میں پیش ہوئی ہے اور کبھی اپنے دور رس نتائج کے اعتبار سے۔

مثال کے طور پر حضرت موسیٰ کا فرعون کے راحت و آرام کو ٹھکرا کر بادیہ پیمائی کے لیے نکل کھڑا ہونا بھی شہادت حق کے فریضہ کا ادا کرنا تھا مگر حضرت ابراہیم کا حق پرستی کی خاطر آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیے جانے پر ثابت قدم رہنا اس سے بڑی شہادت کا نمونہ ہے۔

پھر اگر اپنے سے بھی زیادہ انسان کو اولاد عزیز ہوتی ہے تو ماننا پڑے گا کہ جناب اسمٰعیل کو قربانگاہ میں لانے کے وقت صرف اسمٰعیل ہی شہادت کے لیے نہیں جا رہے تھے بلکہ باپ بھی اپنے فرزند کو اس غیبی اشارہ پر مذبح میں لے جانے اور گلے پر چھری چلانے کی وجہ سے حق کی بارگاہ میں ایک عظیم شہادت پیش کر رہا تھا۔

یہ بے نظیر شہادت اُس بے مثال معیار پر پہنچی ہوئی کہ جب تک حسینؑ کی قربانی کی یاد قائم ہے
اور وہ ہمیشہ قائم رہیگی اُس وقت تک حق نمایاں ہے اور وہ ہمیشہ نمایاں رہیگا
بقول خواجہ غریب نوازؒ ۔

سر داد نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

اگر یزید حضرت امام حسینؑ سے کچھ تعرض نہ کرتا یعنی بیعت کا مطالبہ نہ کرتا تو بحیثیت جانشین رسولؐ حضرت امام حسینؑ شریعت اسلام کی حفاظت کے لیے [illegible] کسی وقت میں کیا کرتے؟ وہ ہم اس وقت نہیں بتا سکتے اور اس کا سمجھنا مشکل بھی ہے مگر اب صورت حال تو یہ پیدا ہوئی کہ یزید نے آپ کی خاموشی اور گوشہ نشینی پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ آپ سے طالب بیعت بھی ہوا یعنی یہ چاہا کہ آپ اُس کے ناجائز افعال پر مہر تصدیق ثبت کر دیں اور اُس کے صحیح جانشین رسول ہونے کا اقرار کر لیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موسیٰ فرعون کی خدائی مان لیں، ابراہیم نمرود کی الوہیت کو تسلیم کر لیں اور حضرت محمد مصطفیٰؐ نہ صرف اتنا کہ بتوں کی مذمت کرنا چھوڑ دیں بلکہ خود بھی معاذ اللہ بت پرستی میں ابو جہل و ابو لہب کے شریک ہو جائیں۔

ایسے حق کا پرستار اور خدا کا نائندہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا؟

اب وقت تھا کہ آپ مادی جاہ و حشم کے مقابلہ میں حق کی شہادت پیش کریں۔ یہ منزل اُسی وقت شروع ہوگئی جب آپ نے ولید کے مطالبۂ بیعت کی قبولیت سے انکار کرتے ہوئے مدینۂ رسولؐ سے جدائی قبول کی اور ترک وطن کر دیا۔ بس اب آپ شہادت کی راہ پر تھے اور ہر قدم جو اُٹھ رہا تھا وہ جادۂ شہادت کا ایک سنگ میل تھا۔

مکہ معظمہ میں پناہ نہ ملنے پر حج کے ارادہ کو ترک کر کے عراق کے ارادہ سے نکل کھڑا ہونا، یہ اس شہادت کا دوسرا باب تھا اور کربلا پہنچ کر جب فوجوں کا ہجوم ہوگیا اور تیس ہزار کا لشکر سامنے صف آرا ہو گیا تو اصطلاحی طور پر حسینؑ کی شہادت دسویں محرم کو عصر کے وقت ہوئی مگر عالم حقیقت میں دیکھیے تو چھوٹے چھوٹے بچوں کی صورتیں آنکھوں کے سامنے، زینب و کلثوم کی ردا و چادر کا خیال ذہن میں اور دشمنوں کے وحشیانہ مظالم کا تصور دماغ میں ―― اور اس سب کے ہوتے ہوئے مجبوراً بحیثیت فاسق بے کنارہ کشی کا عزم بالجزم دل میں ہونا یہ ایک مسلسل شہادت تھی جب حسینؑ کو اپنے ہر تن مو، ہر تار نفس امر یہ شہادت کرتا تھا، آپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ادا کر رہے تھے۔

اور ساتویں محرم سے پانی بند ہو جانے کے بعد چھوٹے چھوٹے بچوں کے دہن سے نکلتی ہوئی العطش کی صداؤں کو سنتے ہوئے، سکینہ کے خشک لب اور علی اصغر کی جان بلب حالت دیکھتے ہوئے، انکار بیعت پر قیام وہ بے پناہ شہادت تھی جو حق کو حق ثابت کر دینے کی ضامن ہو رہی تھی۔

پھر عاشور کے دن اُنھوں نے اپنی اصطلاحی شہادت کے پہلے کم از کم بہتر شہادتیں اپنے ہاتھوں سے پیش کر کے گویا حق کی دستاویز پر خون کی بہتر مہریں لگا دیں جن میں قاسم کے کمسن، علی اکبر کے شباب مجروح اور عباس کی شجاعت حیدری کی شہادت کیا کم تھی کہ آخر میں چھ مہینہ کی جان علی اصغر نے جو ہر مذہب کی زبان میں معصوم تھا باپ کے ہاتھوں پر دم توڑ کر حق کی لازوال طاقت کی ابدی تصدیق کی اور جب یہ بھی شہادت حسینؑ پیش کر چکے تو شریعت اسلام قانون کے مطابق راہ خدا میں جہاد کے فریضہ کو شاندار طریقہ پر ادا کر کے عصر کے وقت سجدۂ خالق میں خنجر قاتل سے ہاتھوں حسینؑ نے اپنی جان کو راہ خدا میں نثار کر دی اور اس طرح

"مقامِ شبیری" بھی بس یہی تھا یعنی معبودِ حقیقی سے ہٹ کر کسی دوسرے کے سامنے سر جھکانے سے انکار۔ طاغوتِ باطل ابتدائے آفرینشِ انسان سے ہر زمانہ میں حق کو دبانے کی کوشش کرتا رہا۔ اگر مادی طاقت کے مقابلہ میں حق دب گیا ہوتا تو آج دنیا میں حق کا وجود نہ ہوتا۔ اگر انبیاء مخالفتوں کی شورش سے مرعوب ہو کر چپ ہو جایا کرتے تو آج دنیا میں اچھی تعلیمات ہمارے سامنے ہوتے ہی نہیں۔

پیامِ حق پہونچانے کا راستہ ہمیشہ خارزار رہا۔ "چون حرفِ حق بلند شود دار می شود" مگر اہلِ حق کبھی سپر انداختہ نہیں ہوئے۔ نہ نمرود کے سامنے ابراہیم نے سر جھکایا۔ نہ فرعون کے سامنے موسیٰ نے اور نہ ابوجہل کے سامنے حضرت محمد مصطفیٰ ص نے۔ پھر حسینؑ یزید کے سامنے سر کیوں جھکاتے؟

ایک دشوار گزار راستہ کیسا ہی حسین ہو اگر ابھی تک کسی نے جانے کی ہمت نہیں کی تو اس پر چلنے کا ارادہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن اگر کچھ رہروؤں کے نقشِ قدم موجود ہوں تو ہمت بلند ہوتی ہے۔

ایسی مثالیں آنکھوں کے سامنے آنے کے بعد بھی تو آج راہِ حق پر قیام میں ہمارے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ کتنے ہی ہیں جو ذرا سختی اٹھا کر صحیح جادہ سے ہٹ جاتے ہیں حالانکہ ہمارے سامنے ہماری پوری تاریخ ہے جسے اسلاف نے پسینے، آنسو اور خون سے مرتب کیا ہے پھر بھی تو ہمارے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ اگر یہ مثالیں ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو کون ہوتا جو حق پر برقرار رہے؟

یاد رکھیے کہ دنیا میں جو کبھی انصاف، عدل، مساوات، حقوقِ انسانی یا ایثار وغیرہ کی صدائیں سننے میں آ جاتی ہیں یہ فیض ہے فقط انہی داعیانِ حق کا۔ ورنہ مادیت کا تو فلسفہ یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام "تنازع للبقاء" پر مبنی ہے۔ بڑا پودا چھوٹے کو کھا جاتا ہے۔ بڑا جانور چھوٹے کو کھا جاتا ہے تو طاقتور انسان کمزور کو فنا کے گھاٹ کیوں نہ اتار دے۔ یہ طاقت کی بنا پر اس کا حق ہے۔ اس فلسفہ کی بنا پر تو ظلم ظلم نہیں رہتا اور عدل کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔ اب اگر اس کے باوجود انصاف و عدل کی آوازیں دنیا میں بلند ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں تو تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ صرف انہی رہنمایانِ دین کی تعلیمات کا اثر ہے جو غیر شعوری طور پر دماغِ انسانی میں مرتسم ہو گیا ہے۔ دنیا لاکھ پلٹے کھائے۔ آسمان اور زمین کے درمیان بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہیں مگر حق نہ بدلے گا، حق نہ بدلے گا تو مقامِ شبیری نہ بدلے گا۔

× حق کے جتنے مظہر تھے وہ کبھی وقت کے ساتھ نہیں بدلے۔ علی ابن ابی طالبؑ کا زہد اور ترکِ دنیا ۲۵ برس کی خانہ نشینی کے دور میں ایسا تصور ہو سکتا تھا کہ یہ بے بسی کا نتیجہ ہے مگر جب آپ کو جمہوری طور پر بھی خلیفۂ اسلام مان لیا گیا اور تختِ حکومت ظاہری طور پر بھی آپ کے زیرِ قدم آ گیا اس وقت بھی دنیا نے دیکھا کہ وہی پیوند دار قبا ہے۔ وہی جو کا سوکھا ہوا آٹا آپ کی غذا ہے۔ جو تبدیلی ہو گئی تھی وہ عامۃ الناس میں [illegible] تھی کہ وہ پہلے آپ کو خلیفہ نہ مانتے تھے اور اب ماننے لگے تھے مگر آپ میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ تھی۔

مامون الرشید نے امام رضاؑ کو سلطنتِ بنی عباس کا ولیعہد کیوں بنایا تھا؟ ایک طرف ایک خیالِ خام کی بنا پر۔ چونکہ ان شخصیتوں کا زہد اور ترکِ دنیا وغیرہ کے صفات کی وجہ سے قلوبِ خلائق پر اثر تھا تو مامون نے اپنی پست ذہنیت کے ماتحت نظرِ دنیا کو یہ تجربہ کرانا چاہا تھا کہ دیکھو یہ بھی جب دنیا میں پڑ جاتے ہیں تو

مقامِ شبیری

وہ تقریر جو ۲ محرم ۱۳۷۲ھ میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کی کوٹھی (دین دیال روڈ۔ لکھنؤ) میں ہوئی۔

حقیقت ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

یہ اسلام کے مشہور مفکر شاعر ڈاکٹر اقبال کا مشہور شعر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حقیقت ہونا خود ابدی ہونے کا ذمہ دار ہے۔ حقیقت وقت کی پیداوار نہیں ہوتی۔ حقیقت انقلاب روزگار سے نہیں بدلتی۔ حقیقت طبائع کے رجحانات کے ساتھ مختلف نہیں ہوتی۔ لو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض ۔ "اگر حق انسانی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو زمین و آسمان اور سب چیزیں تہ و بالا ہو جائیں"۔

حق ایک خطِ مستقیم ہوتا ہے اور خطِ مستقیم دو نقطوں کے درمیان ایک ہی ہو سکتا ہے۔ باطل ادھر ادھر کے خطوط ہوتے ہیں جو بکثرت ہو سکتے ہیں۔

حق خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ آپ کہتے ہیں "حق سبحانہ و تعالیٰ"۔ وہ حق اسی لیے ہے کہ ثابت ہے غیر متزلزل۔

مقامِ شبیری بھی حقیقت ابدی اسی لیے ہے۔ بدل سکتا ہے وہ شخص کہ جو جذبات کا پابند ہو۔ وقتی سیاست اپنا چولا بہت جلدی جلدی بدل سکتی ہے مگر وہ ذات جو مقامِ طاعت میں عین حق بن گئی ہو ایسے انسان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

حق ناقابل تقسیم ہے اور پھر غیر اضافی شے ہے۔ اس لیے اس میں ذرہ بھر تبدیلی کا امکان نہیں ہوتا۔ اگرچہ شاعر نے بضرورت شعر صرف لفظ "ابدی" کہا ہے مگر درحقیقت وہ ازلی بھی ہے۔ مقامِ شبیری ازلی اور ابدی دونوں ہے۔ اس لیے کہ وہ مجسم دین ہے اور دینِ الٰہی ازل سے ایک ہے اور ابد تک ایک ہی رہیگا ان الدین عند اللہ الاسلام ۔ یہ دین نام ہے صرف معبودِ حقیقی کے سامنے سر نیاز جھکانے کا۔ آدم۔ نوح۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ اور دیگر تمام انبیاء سب اسی کے معلم تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عامۂ بشر کے ظرف صلاحیت کے اعتبار سے اُس کے پیمانہ میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔

جیسے ایک طالب العلم اسکول میں داخل ہو۔ بی۔ اے۔ انگریزی جس تعلیم میں جا بجا ابتدائی درجہ سے انتہا تک اس کا نصب العین اصل ایک ہے اور وہی انتہائی نقطہ لیکن ایک دم اُسے بی۔ اے کی تعلیم دی جائے تو بچہ کا ذہن کہاں قبول کر سکتا ہے۔ اس لیے ہر درجہ کا کورس الگ الگ ہے مگر وہ مختلف اور متضاد نہیں ہے۔ اسی طرح سابق انبیاء کی تعلیمات اور ان کا انتہائی نقطہ حضرت محمد مصطفیٰ کی تعلیم ہے جو ظاہر بظاہر اسلام کے نام سے موسوم ہوئی۔

اسی طرح نعمان بن بشیر حاکم کوفہ۔ امام حسینؑ کے فرستادہ مسلم بن عقیل کے مقابلہ میں یزید کے منشا کی تکمیل سے قاصر رہا۔

یہ نتیجہ تھا اسی حقانیت کا جو حسینؑ میں ان کی مخالف جماعت کے بھی ذی شعور افراد کو محسوس ہوتی تھی۔ خود عمر سعد نے جو کربلا میں امام حسینؑ کے بالمقابل فوج کا افسر بنا کر بھیجا گیا تھا صاف صاف اقرار کیا کہ امام حسینؑ کا طرز عمل امن پروری اور صلح کوشی پر مبنی ہے۔ نیز یہ کہ یزید سے بیعت کی توقع ایک بے جا ہے۔

یہ "مقام شبیری" وہی ثبات قدم ہے جس کی نظیر میں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ سب ہی کے یہاں نظر آتی ہے اور بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں مشکلات و مصائب اتنے نہیں آئے جتنے حسینؑ کے سامنے آئے۔ اس لیے حسینؑ کا موقف بلند تر نظر آتا ہے۔

حق پرستیات کا نام اگر "ضد" ہے تو جتنے انبیاء تھے سب انتہائی ضدی تھے۔ ان انبیاء کا کیا ذکر خود خلاق عالم سے بڑھ کر ضدی کون ہو سکتا ہے کہ جو نبی آتا ہے قتل ہو جاتا ہے۔ جو رسول بھیجا جاتا ہے اس کی تکذیب ہوتی ہے طرح طرح سے ایذا رسانی کی جاتی ہے مگر وہ تھا کہ انبیاء بھیجے ہی چلا جاتا تھا اور دنیا میں دین کا سلسلہ اس نے برابر قائم رکھا اور اعلان کر دیا کہ تم اللہ کے طریقہ میں تبدیلی اور انقلاب کبھی نہ پاؤ گے۔

باطل اس کے بالمقابل حق کو دبانے کی طرح طرح سے کوشش کیا کرتا ہے۔ اس کا بھی لقب الگ ہے یعنی حق کو دبانے کی کوشش کرنا جس کو کمال کا رمز شاعر نے "کوفی و شامی" کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یہ "کوفی و شامی" نام ہے اہل باطل کا۔ ان کے انداز حق کو شکست دینے کی کوششوں میں بدلتے رہتے ہیں۔ آتش نمرود، مظالم فرعون، یحییٰ کا سر قلم کیا جانا، زکریا کو آرے سے چیر ڈالنا، جرجیس کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال کر ابالنا، پھر حضرت خاتم الانبیاء کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانا۔ دیگر رہنمایان دین کے منہ کے سامنے زہر کے پیالے اور کبھی گردنوں پر کھنچی ہوئی تلواریں۔ یہ سب وہ کوفی و شامی انداز تھے جو موقف شبیری کے سامنے آتے ہیں جیسا کہ اقبال نے دوسری جگہ کہا تھا۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید — این دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوت شبیری است — باطل آخر داغ حسرت میری است

حقیقت ناقابل تبدیل ہوتی ہے مگر باطل اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ حق کا اقرار ضمیر کے دباؤ سے اہل باطل کو اکثر اوقات کرنا ہی پڑتا ہے۔ رسولؐ کی امانتداری کا عملی اظہار مشرکین نے دشمنی کے باوجود اپنی امانتیں شب ہجرت تک رسولؐ کے پاس رکھوا کے کیا۔ یہ باطل کی طرف سے حق کی قوت کا اقرار تھا۔

حسینؑ کے حق پر ہونے کا بھی باطل والوں کو یقین تھا۔ ولید کوفی و شامی حکومت کا نمائندہ ہے مگر آپ نے دیکھا اس نے اقرار کیا کہ جو حسینؑ کو قتل کرے گا وہ روز قیامت ناکام و نامراد ہوگا۔ ابن سعد بھی اسی طاقت کا سرغنہ تھا مگر اسے حق سے متاثر ہو کر بار بار اپنا مرکز چھوڑنا پڑتا تھا۔ فوج شام کا حسینی جماعت کی مختصر تعداد کے سامنے سے فرار کیا تھا؟ اپنے مرکز سے بار بار متزلزل ہی تھا

تمام زہد اور سادگی ختم ہو جائے مگر اس تجربہ کا نتیجہ الٹا ہوا یعنی دنیا نے آنکھوں سے یہ دیکھا کہ یہ سلطنت کے سب سے بڑے صاحب اقتدار رکن ہونے کے باوجود اپنے مکان پر چٹائی ہی پر بیٹھے ہیں۔ ان کا غذا و لباس وہی ہے جو پہلے تھا اس کی وجہ سے ان کی روحانیت کا قلوب پر اور زیادہ اثر بڑھنے لگا۔ اس کا تدارک تھا جو بعد میں حضرت کو زہر دے کر کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ابدی ہے وہ عملی مرقعے ہیں جن میں وقت کے ساتھ تبدیلی نہیں ہوتی۔

رسول اللہؐ کی خاص صفت کردار جو دنیا میں نمایاں ہو گیا تھی وہ سچائی اور امانت داری۔ آپ کا لقب ہی صادق اور امین ہو گیا تھا۔ ۴۰ برس تک ان اوصاف کی بنا پر وہ ہر دلعزیزی رہی کہ پوری قوم آپ کے لیے آنکھیں بچھاتی تھی مگر جب پیام حق کی آواز بلند کی کہ خدا کو ایک مانو۔ بت پرستی ترک کرو تو وہ پوری قوم دشمن ہو گئی مگر امانتیں مشرکین کی آپ کے پاس شب ہجرت تک تھیں یہاں تک کہ جب سب متفق ہو گئے کہ رات کو آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں تب بھی یہ خیال نہیں ہوا کہ پہلے اپنی امانتیں واپس لے لو۔ خون بہانے پر تیار تھے مگر اپنی امانتوں کے تحفظ کا یقین تھا اور آپ نے بھی اُن کی امانتوں کے تحفظ کے لیے یہاں تک کیا کہ اپنی گود کے پالے ہوئے اپنی جان سے زیادہ عزیز بھائی کو خطرہ میں ڈال دیا مگر کہہ دیا کہ یا علی جب تک امانتیں مشرکین کی اُن تک واپس نہ کر لینا مدینہ نہ چھوڑنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ ہستیاں ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوست ہو یا دشمن بہر حال امانتیں ہیں اور اُن کی حفاظت ضروری ہے۔

یہی بلندی اوصاف کی منزل وہ ہوتی ہے جہاں دوست اور دشمن سب کو یکساں طور پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ حسینؑ ایسے ہی صفات کے حامل تھے چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ نے امیر شام معاویہ کو احتجاجی خط لکھا ہے اور اس خط کو پڑھ کر انھیں ناگواری محسوس ہوئی تو حاضرین دربار میں سے کسی نے خوشامد میں کہہ دیا کہ آپ بھی حسینؑ کو ایسا خط لکھ دیجیے جو اُن کی نظر میں خود اُن کو سبک کر دے تو امیر شام نے کہا کہ یہ تو تم نے کچھ صحیح مشورہ نہیں دیا اس لیے کہ جو کچھ میں انھیں لکھوں وہ اگر غلط ہے تو اس کے لکھنے پر سبکی میری خود ہوگی اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو برائیاں پاؤں کہاں سے جو ان کے متعلق انھیں درج کروں۔

یہ حقیقت کا مقام وہ ہے جو مستقل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اضافی نہیں ہے۔ اضافی کا مطلب یہ کہ جیسے کسی عزیز کی نسبت انسان بڑا احسان کرنے والا ہے مگر غیر کی نسبت وہ احسان نہیں ہے تو وہ اچھائی اس کے لحاظ سے ہے مگر اس کے لحاظ سے نہیں ہے۔ اس کے برخلاف وہ اچھائی جو غیر اضافی ہو یہ ہے کہ ہر ایک کی بہ نسبت اور ہر ایک کے سامنے وہ قائم رہے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب یزید نے مطالبہ بیعت کے لیے ولید بن عتبہ کے پاس خط لکھا تو اگرچہ ولید خود بھی بنی امیہ میں سے بلکہ آل ابو سفیان میں سے تھا یعنی یزید کا چچا زاد بھائی تھا اور اسی کی طرف سے مدینہ کا حاکم بھی تھا مگر اس نے بھی حسینؑ سے بیعت کے مطالبہ کو حق بجانب نہیں سمجھا اور جب مروان نے مشورہ دیا کہ بیعت نہ کریں تو ابھی سر قلم کر دو تو وہ اس مشورہ پر عمل سے قاصر رہا اور جب مروان نے زجر و توبیخ کی کہ تم نے میرا کہا نہ مانا اب حسینؑ پر دسترس پانا مشکل ہے تو ولید نے یہ فقرے کہے جو طبری میں درج ہیں کہ "میں عمل کیونکر کرتا۔ تم نے تو مجھے ایسی رائے دی جس میں میرے دین کی ہلاکت ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ وہ شخص جو قتل حسینؑ کے جرم میں گرفتار رہے گا اس کے اعمال خیر کا پلہ بعد قیامت انتہائی سبک ہوگا۔"

واقعۂ کربلا سے درسِ اخلاق

گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کی ایک تقریر ۔

اخلاق کی دنیا بہت وسیع ہے یہاں تک کہ بڑی ضخیم کتابیں فنِ اخلاق پر تصنیف ہو چکی ہیں اور وہ ایک مستقل علم بنا ہوا ہے ۔

بظاہر ویسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اخلاق کے معیار یکساں نہیں ۔ بعض ملکوں اور قوموں میں جو باتیں محاسنِ اخلاق میں سمجھی جاتی ہیں وہی دوسری جگہ یا دوسری قوموں میں بری خیال کی جاتی ہیں ۔ ایک وقت میں جو چیز خوش اخلاقی میں داخل ہوتی ہے دوسرے وقت میں بد اخلاقی قرار پا جاتی ہے ۔ اس طرح اخلاق کے حدود کی پوری تعیین دشوار محسوس ہونے لگتی ہے ۔

سمجھ

لیکن غور کرنے پر سمجھ میں آتا ہے کہ خوش اخلاقی اور بد اخلاقی کے حدود میں جو کچھ اختلاف یا ابہام نظر آتا ہے

۳ وہ جزئیات کے اعتبار سے ہے مگر وہ کلی معیار جس کے تحت میں آنے سے کوئی شے خوش اخلاقی یا بد اخلاقی بن سکتی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ وہ مفہوم کلی دونوں قسم کے اخلاق کا عدل اور ظلم ہے ۔ جو شے عدل کے تحت میں داخل ہو وہ سب کے نزدیک مستحسن ہوگی اور جو ظلم کے تحت میں ہو وہ سب کے نزدیک مذموم ۔ یہ اور بات ہے کہ کسی شے کے بارے میں اس امر میں اختلاف ہو جائے کہ وہ ان میں سے کس عنوان کے تحت میں داخل ہے ۔

عدالت کا جامع اور وسیع مفہوم کیا ہے ؟ حقوق و حدود کی حفاظت اور ظلم کیا ہے ؟ حقوق و حدود کے خطوط سے تجاوز ۔ قرآن مجید نے بھی ظلم کا معیار یہی بتایا ہے : ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون " وہ جو قدرت کی مقرر کردہ حدوں سے قدم آگے بڑھاتے ہیں وہ ظالم ہیں " ۔

۲ اختلاف صحیح حدود کی تعیین اور جابجا حقوق کی تشخیص میں ہوتا ہے مگر حق کو ماننے کے بعد ہر شخص اس سے تجاوز کرنے والے کو ظالم اور اس ظالم کو قابلِ مذمت و ملامت سمجھے گا ۔ اختلاف اس میں ہوگا کہ یہ ظلم ہے یا نہیں لیکن ظلم ہر ایک کے نزدیک برا ہوگا ۔ چاہے وہ کسی بھی قوم یا ملک کا پروردہ یا فتہ اور باشندہ ہو ۔ یہ اصول اخلاق ہیں ۔ انہی کے حکم میں ہیں امانت اور خیانت ، سچائی اور دروغ گوئی وغیرہ ۔

یقین کیا جا سکتا ہے کہ جو جھوٹا ہے وہ بھی سچ کو اچھا سمجھتا ہے ورنہ سچا بننے کی کوشش نہ کرے اور اگر سچا ہے نہیں تو جھوٹا ہی کیوں قرار پائے ۔ جھوٹ کی عمارت خود قائم ہے سچائی کی قدر و منزلت کے احساس پر ۔ اسی طرح کوئی بڑے سے بڑا بد دیانت ہو اسے " بے ایمان " کہیے تو وہ برا مانے گا اور اپنے دشنام سمجھے گا ۔ ظالم کو اگر ظالم کہیے تو وہ خوش نہ ہوگا اور خائن کو خائن کہیے تو وہ ہرگز شائستہ نہ ہوگا ۔

اور پھر حکومت امویہ کے مقابلہ میں جمہور کی برہمی کیا تھی؟ حالانکہ دیکھیے تو جمہور سب ہی کوفی و شامی بن چکے تھے مگر ان پر یہ اثر ابھی کمزور تھا۔ اس لیے ان میں بہت سے افراد میں مستقل تبدیلی پیدا ہو گئی۔

حسینؑ کی جنگ ہی یہی تھی۔ وہ باطل کی ذہنیت کو شکست دینے کے لیے آئے تھے چنانچہ اپنے ساتھ ایسے ہی سامان لائے تھے جو ضمیر انسانی کے شعور کو بیدار کر سکیں۔

حسینؑ کی آنکھوں کے سامنے ان کی فتح کے آثار نمودار تھے۔ حر کا فوج مخالف سے ادھر آ جانا اُن کی فتح کا ناقابل انکار ثبوت تھا۔

اور پھر جو کوفی و شامی محاذ کو دنیا طلبی کی زنجیروں کی وجہ سے بالکل نہ چھوڑ سکے اُن کے بھی حالات سے اُن کا تزلزل نمایاں تھا۔

قتل حسینؑ کے وقت متعدد اشقیاء کا تلوارین پھینک کر بھاگنا کیا تھا؟ شہادت حسینؑ کے بعد لوٹ کے وقت کسی شقی کا شہزادی کے پاؤں سے خلخال اتارنا مگر اس کے ساتھ روتے جانا کیا تھا؟

سب سے بڑا ذمہ دار یزید بدلا کہ نہیں؟ جنگ براہ راست کاہے کی تھی؟ طلب بیعت ہی کو تو تھی اور حسینؑ سے طلب بیعت بحیثیت شخص واحد تو نہ تھی بلکہ خاندان رسول کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ مگر یہی حیثیت حسینؑ کے بعد زین العابدینؑ کو حاصل ہو گئی تھی اور وہ یزید کی طاقت باطل کے حصار میں اسی کے دربار کے اندر موجود تھے مگر یزید کو اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سید سجادؑ سے بیعت کا مطالبہ کرتا بلکہ حسینؑ کے کسی ایک بچہ تک سے یہ نہ کہہ سکا کہ بیعت کرو۔ حسینؑ اور اُن کے بعد اُن کی اولاد اپنے موقف سے ذرہ بھر کبھی نہیں ہٹی اور یزید خود ہی اپنے مطالبہ پر اصرار سے مجبور ہو کر باز آگیا۔ سچ کہا ہے اقبال نے:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

کیونکہ اس میں اس تصور کی گنجائش تھی کہ اگر اس سے بڑھ کر کوئی چیز لائی جائے تو شاید نفس
بک جائے بلکہ آپ نے جواب میں اپنی طرف سے ایک ایسا پیمانہ پیش کر دیا جو حدودِ امکان سے
خارج ہے یعنی یہ کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند رکھ دو اور دوسرے ہاتھ پر سورج تو بھی اس پیامِ حق کی
تبلیغ نہ چھوڑوں گا۔ اس کے بعد کوئی منزل نہیں رہ جاتی اس تصور کی کہ کوئی شے ایسی ہو سکتی ہے جو کہ
انہیں جادۂ حقیقت سے متزلزل بنا سکے۔

دوسری چیز ہوتی ہے خوف۔ اس میں بھی منزلیں مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی ذرا سے مالی نقصان کو
نہیں برداشت کر سکتا۔ کوئی مالی نقصان کی پرواہ نہیں کرتا مگر جان کی نوبت آ جائے
تو خائف ہوتا ہے۔ کوئی آبرو ریزی سے ڈرتا رہتا ہے اور ان تمام خطرات سے تحفظ
کبھی عقلی و شرعی معیار پر مستحسن بھی ہوتا ہے۔ یہ اس وقت جبکہ نقصان زیادہ اہم ہو۔
پھر بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جن میں صرف خطرات موہوم لب کشائی سے مانع ہوتے ہیں اور
بعض ایسے جو خطرات کے یقینی ہو جانے کے بعد سرانداختہ ہوتے ہیں۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کم از کم اُن کی تائید قوت میں داخل ہے لیکن یہ
خارجی محرکات یعنی طمع اور خوف وہ ہیں جو اس راستے سے ہٹاتے ہیں اور افرادِ انسانی کو
عملاً بد اخلاقی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں تو اب اصلی درسِ اخلاق وہ نہیں ہے جو دنیا کے سامنے
مبسوط ان سبقوں کو دہرائے کہ حق پر قائم رہنا اچھی چیز ہے۔ عدل و انصاف اچھی چیز ہے۔
امانت و دیانت اچھی چیز ہے۔ یہ درس اپنی جگہ پر بالکل درست مگر وہ اس لیے زیادہ ضروری
نہیں کہ ان باتوں کو اچھا تو خود ہر انسان کا ضمیر سمجھتا ہے مگر وہ سمجھنا کس کام جس کے مطابق
عمل نہ ہو سکے۔ اور عمل نہیں ہوتا فطرت پر دباؤ ڈالنے والے انہی رجحانات یعنی طمع اور خوف کے سبب
پھر اصل درسِ اخلاق کہاں ملے گا اور حقیقی معلمِ اخلاق کسے سمجھنا صحیح ہے۔ اسی کو
جہاں ان رجحانات کو شکست دے کر عملاً دکھا دیا گیا ہو اور یہ پیش ہوا ہو کہ کس طرح ایک
مردِ خدا کو دنیا کی کوئی طمع اور کسی قسم کا خوف و خطر راہِ حق سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔
جس نے عملی طور پر یہ مثال پیش کر دی ہو وہی سب سے بڑا معلمِ اخلاق ہے۔ اسی کی بارگاہ سے
ہمیں یہ درس مل سکے گا کہ کس طرح ہم اچھائی اور سچائی کے راستے پر قائم رہیں اور بڑی سے
بڑی طاقت ہم کو اس سے ہٹا نہ سکے۔

ہمارا عالم کیا ہے ذرا اپنے نفسیات کا جائزہ لیجیے۔ صرف ایک عدد آدمی۔ جی ہاں
فقط ایک مگر وہ بڑا آدمی ہے ہم سے کسی بات کو کہتا ہے جسے ہم سمجھتے ہیں کہ غلط ہے مگر چونکہ

یہ دلیل ہے اس کی کہ ان اصول اخلاق کا احساس عقل عمومی اور فطرت بشری میں متفقہ حیثیت سے مضمر ہے۔ ہر شخص ان اچھے اخلاق کو پسند اور برے اخلاق کو ناپسند کرتا ہے۔ چاہے وہ خود ان برائیوں میں مبتلا ہو۔

اس کی ایک آسان پہچان یہ ہے کہ ہر شخص خود جب کبھی کسی کی مذمت کرتا ہے تو دیکھیے وہ اس کے بارے میں کیا کیا کہتا ہے؟ یقیناً وہ اس کی برائیوں میں یہی کچھ کہے گا کہ بدکار ہے۔ دغاباز ہے۔ جعل ساز ہے۔ جھوٹا ہے۔ ظالم ہے۔ بے ایمان ہے وغیرہ وغیرہ۔ پس اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں اس کے نزدیک بھی برائی میں داخل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود عملاً ان سے متصف ہو۔ اسی طرح جب وہ کسی کی تعریف کرنا چاہے تو دیکھیے کیا کہتا ہے؟ سوا اس کے کچھ نہیں کہ وہ بڑا ایماندار ہے۔ بڑا سچا ہے۔ بڑا ہمدرد ہے۔ بڑا منصف ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس سے ثابت ہے کہ مدح اور مذمت کے افراد سب کے نزدیک بلا اختلاف معین و مقرر ہیں اور یہ وہ محامد اخلاق ہیں جن کا شعور فطرت انسانی میں مضمر ہے۔

کل مولود یولد علی فطرة الاسلام۔ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر برائیوں کی طرف کیونکر جاتا ہے؟ خارجی محرکات ہیں جن کا جامع عنوان ہے طمع اور خوف۔ طمع کی ایک منزل ہے صرف وقتی حظ نفس۔ اس کے آگے مال و دولت۔ جاہ و عزت یا شہرت اور کبھی صرف ہم رنگ جماعت ہونے کی لذت۔

مال و دولت میں بھی انسانوں کی قیمت مختلف ہے۔ کوئی چند پیسوں میں راہ حق سے ہٹنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ کسی کے لیے چند روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی کا نرخ سینکڑوں یا ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ دس ہزار کی رشوت کسی کے سامنے پیش کی گئی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ آپ نے کہا بڑا دیانتدار ہے۔ مگر آپ کو اس کے دل کی حالت کیا معلوم۔ شاید وہ اس قیمت کو اپنے لیے کم سمجھ کر روگرداں ہوا ہو۔ اگر اسے اس قیمت کا دگنا کر دیا جاتا تو وہ معاملت کے لیے تیار ہو جاتا۔ اسی لیے سچائی کے سب سے بڑے علمبردار حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کے سامنے جب ان کی حق پرستی کے مقابلہ میں پیشکش کی گئی کہ جس عرب خاندان میں کہیے آپ کی شادی کر دی جائے۔ جتنا مال و دولت کہیے حاضر کر دیا جائے۔ فرمائیے تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں تو اگرچہ ان لوگوں نے اپنے پیمانۂ نظر کے مطابق بڑی سے بڑی چیز پیش کی تھی مگر آپ نے جواب میں صرف انکار پر اکتفا نہیں فرمائی

تعلیمات کوئی خیالی حیثیت نہیں رکھتیں جو علمائے اخلاق کی خوبصورت درس کی طرح کتابوں کے صفحات میں محدود رہیں بلکہ یہ عملی حیثیت رکھتی ہیں، ایسی جو کم از کم بہتر افراد کی جماعت کے اندر جیتی جاگتی شکل میں نظر آ رہی ہیں۔

کسی مذہب کی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بیک وقت دو چار فرد شاید مل جائیں جو اس کی تعلیمات کا معیاری نمونہ پیش کر سکیں لیکن یہ اسلام کے مدرسۂ اخلاق کی خصوصیت تھی۔ اہل بیت رسولؐ کے زیر تربیت بیک وقت اتنی بڑی جماعت دنیا کے سامنے پیش ہو رہی تھی جس کی مثال صفحۂ کائنات پر دوسری نہیں ملتی۔

اس سے سمجھیے کہ کربلا کے واقعہ کو دنیائے انسانیت کے لیے کب تک یاد رکھنے کی ضرورت ہے! جب تک اس کا قائم مقام کوئی دوسرا مل نہ جائے اور یہی راز ہے اس کارنامہ کی ہمہ گیر کشش اور اس کے تذکرہ کی دائمی بقا کا۔

حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے سامنے وہ تمام چیزیں تھیں جو کسی انسان کو راہِ حقیقت سے ہٹایا کرتی ہیں اور مکارم اخلاق کے جادہ سے منحرف بناتی ہیں۔

شخصیت کے اعتبار سے دیکھیے تو بیعت طلب کرنے والا یزید تھا جو عالم اسلامی کا شہنشاہ بنا ہوا تھا۔ کثرت اس طرف تھی اور کیسی کثرت۔ بلا مبالغہ تمام دنیائے اسلام اس کے سامنے سر جھکا چکی تھی اور سب ہی بیعت کر چکے تھے اور اگر سب بیعت نہ کر چکے ہوتے تو تاریخ ان اشخاص کے ناموں کو شمار کر کے ہمارے سامنے کیوں پیش کرتی جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ خود یزید کے باپ امیر شام معاویہ کے یہی الفاظ تاریخ میں درج ہیں کہ میں نے تمام مسلمانوں کی گردنیں تیرے لیے جھکا دی ہیں۔ صرف چار آدمیوں سے مجھے دغدغہ باقی ہے۔ یہ چار بھی کہنے کو چار تھے ورنہ امیر شام خوب جانتے تھے کہ ان میں اصل حسینؑ ہی ہیں چنانچہ انھوں نے مدینہ میں آنے کے بعد امام حسینؑ کو دیکھ کر یہی کہا تھا کہ ابھی تک چار آدمی الگ ہیں جن میں قیادت کرنے والے آپ ہیں۔

پھر اس شخصیت اور اکثریت کے مقابلہ میں امامؑ کا یہ فرمانا کہ بیعت نہیں کروں گا، اس میں خطرات کیا درپیش تھے؟ جتنی قسم کے خطرے کسی کے پیش نظر ہو سکتے ہیں وہ سب مجموعی طور پر امام کے پیش نظر تھے چنانچہ وہ خطرے تدریجی طور پر واقعیت کی شکل اختیار کرتے رہے مگر حسینؑ نے جو انکار کیا تھا وہ کب تک باقی رہا؟ اس کی حد کون بتا سکتا ہے۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ ظلم و تشدد کے

وہ بڑا آدمی ہے۔ اس لیے ہمیں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ اُس سے انکار کر دیں۔

الکشن میں کیا ہوتا ہے؟ طے ہوئے ہوتے ہیں کہ اب کی فلاں کو ووٹ نہ دینگے مگر الکشن سے پہلے ایک بڑی ہستی غریب خانہ پر آگئی۔ حالانکہ اس کے پہلے یہ ہستی وہ تھی کہ راستہ میں ملتی اور یہ غریب جھک کر سلام کرتا تو وہ منھ پھرا لیتے یا گوشہ ابرو سے جواب سلام دیتے مگر آج ووٹ لینا ہے تو وہ خود غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں۔ بس جناب! اب تو منھ سے نہیں نکل سکتا کہ جی۔ میں تو دوسرے شخص کو بہتر سمجھتا ہوں اب سوا اقرار کے انکار ممکن ہی نہیں اور نتیجہ میں کیا ممکن کہ سوا اُس شخص کے کسی دوسرے کو ووٹ دیا جائے۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ ارے۔ یہ کیا۔ تم تو ان کی بہت برائیاں کرتے تھے۔ اب ووٹ انہی کو دے رہے ہو۔ کہا کیا بتاؤں۔ فلاں صاحب غریب خانہ پر خود تشریف لائے۔ اب مخالفت کیونکر ہو سکتی ہے؟ نتیجہ نہ تو پیسے۔ نہ بندوقیں نہ تلوار کچھ نہیں۔ بس فقط "بڑے آدمی" اور "انھوں نے یہ فرمایا" نظام جمہوریت میں اکثریت کے آراء اکثر اسی قسم کے رجحانات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسی قسم کی اکثریت حقانیت کی ضمانت دار کیا ہو سکتی ہے مگر عام طور سے اہل دنیا اسی راستے پر چلتے۔ اسی سیلاب میں بہتے اور اسی ہوا میں اُڑتے ہیں۔

بڑے آدمی کے خلاف چھوٹا، اکثریت کے مقابلہ میں کوئی ایک آدمی اول تو سوچتا ہی نہیں۔ عموماً ایک آدمی انہی ہزار کی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ اپنی آنکھوں کی طاقت سے کام ہی نہیں لیتا اور اگر سوچتا ہے یعنی دماغ کی طاقت جواب نہیں دیتی تو دل کی ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جو کچھ سوچا ہے اور سمجھا ہے اُس کے مطابق کہہ نہیں سکتا اور عمل نہیں کر سکتا۔ تمام بد اخلاقیوں اور غلط کاریوں کا سرچشمہ اس قسم کے محرکات ہیں لہٰذا حسینؑ نے ان محرکات میں سے ہر چیز کو شکست دے دی ہو اُس سے بڑھ کر معلم اخلاق کون ہے؟

حسینؑ اُس ہستی کے ورثہ دار تھے جس کا اعلان یہ تھا کہ انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق "میں صرف اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق فاضلہ کی تکمیل کروں۔" اور جسے خالق نے سند بھی عطا کی تھی کہ انک لعلیٰ خلق عظیم "آپ عظیم اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں" حسینؑ نے ان کی گود میں پرورش اسی دن کے لیے پائی تھی کہ یہ اُن کے کام کو عملی دنیا میں انتہائی نقطہ پر پہنچ کر کے دکھا دیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ میرے جد بزرگوار کے اخلاق

حسینؑ اور اُن کا کارنامہ جس کے پیش نظر رہے وہ ممکن نہیں کہ سچائی اور اچھائی کی راہ کو کسی بھی ناجائز دباؤ سے چھوڑ دے۔ انسان اگر حق سے ہٹے گا تو حسینؑ کو بھول کر ہی ہٹے گا اور یہی مکارم اخلاق کے بقاء و قیام کا سنگ بنیاد ہے۔

اس کے علاوہ جزئی طور پر بھی امام حسینؑ نے کربلا میں مکارم اخلاق کے ہر شعبہ پر عمل کر کے ہر ایک کے لیے ایک مثال قائم کر دی۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کسی شعبہ کو تشنۂ عمل نہیں چھوڑا۔ حالانکہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کی پابندی کا عموماً سکون و اطمینان کے اوقات میں موقع سمجھا جاتا ہے۔ مصیبت و اضطراب کے ہنگام تو مستثنیات میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس وقت اگر اخلاقیات میں سے کسی اصول کی پابندی نہ بھی کی جائے تو اُسے فروگزاشت نہیں سمجھا جاتا جیسے ایک شخص انتہائی پابند شرع نماز فریضہ کو اول وقت بجا لانے کا پابند ہے مگر مصیبت، خوف و دہشت یا کسی بھی اضطراب کے موقع پر نماز دیر سے پڑھتا ہے اور بلا کسی شرم و ندامت کے کہتا ہے کہ آج اتنا پریشان تھا کہ نماز بھی اول وقت نہ پڑھی اور عقلاء بھی اس کو ذرہ برابر مورد الزام نہیں سمجھتے۔

ایک نہایت با اخلاق شخص ہمیشہ خود سے سلام کرنے کا عادی اور کسی پریشانی کے ہنگام میں دوسرا سلام کرتا ہے۔ وہ جلد اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور قابل معافی سمجھا جاتا ہے۔

اب کربلا سے بڑھ کر تصور کیجیے کہ کیا کوئی ہنگام مصیبت و دہشت و اضطراب ہو سکتا ہے؟ اور اس کے باوجود امام کا نماز کے متعلق اہتمام دیکھیے۔ اعزاء کے ساتھ سلوک میں حفظ مراتب کا خیال دیکھیے اور ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک دیکھیے۔

ان مواقع پر اخلاق کو برت کر حسینؑ نے دماغ انسانی میں ان اخلاق کے جذب ہو جانے کی وہ صلاحیت پیدا کر دی ہے جس کا محو ہونا غیر ممکن ہے۔

انتہا یہ ہے کہ اُس وقت جب آپ رخصت آخر کے لیے در خیمہ پر تشریف لائے ہیں۔ اس وقت کے عالم کا خیال کیجیے۔ انصار رخصت ہو چکے ہیں، اعزاء داغ مفارقت دے چکے ہیں۔ بھائی کے مارے جانے سے کمر ٹوٹ چکی ہے۔ جوان بیٹے کو دم توڑتے آنکھوں سے دیکھا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابھی شیر خوار بچے کی قبر بنا کر اٹھے ہیں۔ اب خود سفر آخرت کے لیے جا رہے ہیں

امکان میں آگے بڑھنے کی گنجائش نہ رہی اور حسینؑ کا انکار اپنے محل پر برقرار رہا۔ یہاں تک کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ کسی رسول، کسی نبی، کسی مصلح، کسی داعیٔ حق کے بارے میں ہم معین کرکے یہ بتا سکتے ہیں کہ اُس نے کیا قربانی پیش کی مگر امام حسینؑ کے بارے میں تو یہ ڈھونڈھنا ہے کہ کون چیز قربان نہیں کی اور ڈھونڈھنے پر اس تلاش میں کامیابی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

دشمن اسلحہ بڑھاتا رہا۔ دباؤ زیادہ سے زیادہ کرتا گیا مگر وہ ذرہ بھر بھی حسینؑ کو متاثر نہ کر سکا۔ حُر کے ساتھ والا ایک ہزار کا رسالہ ہی کیا کم تھا۔ زہیر بن قین کہہ رہے تھے کہ مولا ہمیں ان سے نپٹ لینے دیجیے ورنہ اتنی بڑی فوج آجائے گی جس کا ہم مقابلہ نہ کر سکیں گے مگر ایک ہزار اور ایک لاکھ میں فرق تو وہ دیکھے جو کسی نقطہ پر بھی کثرت تعداد سے مرعوب ہو سکتا ہو۔ امامؑ کو تو اصول پیش نظر تھا۔ اخلاقی اصول کہ ہم جنگ میں ابتدا نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے نتیجہ میں چاہے ایک ہزار کا لشکر بڑھ کر تیس ہزار تک پہنچے اور چاہے ایک لاکھ تک۔

۷ محرم تک سرزمین کربلا کثرت لشکر سے چھلکنے لگی۔ ساتویں سے پانی بند کر دیا گیا۔ حسینؑ اکیلے نہیں تھے۔ اُن کے ساتھ عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے۔ ایک دو وقت نہیں تین دن گزر گئے۔ بچے العطش العطش کہہ رہے تھے۔ خود امام کی پیاس سے یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا آنکھوں کے سامنے دھواں چھایا ہوا ہے مگر اس پر بھی انکار بیعت کے عزم میں کچھ بھی ضعف نہ تھا۔ امام کا کیا ذکر کوئی بچہ تک یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ اب تو سختیاں نہیں اٹھ سکتیں۔ اب یزید کی بیعت ہی کر لی جائے۔

اس کے بعد عاشور کے دن جو کچھ ہوا کسے معلوم نہیں۔ دشمن کے پاس کوئی حربہ باقی نہیں رہا۔ سب حربے ختم ہوگئے مگر حسینؑ پر اثر نہ ڈال سکے۔ آخر میں ظالم بے بس ثابت ہوا اور صبر کا ہمالہ اپنی جگہ قائم رہا۔

آخر میں نیزوں پر سر تھے اور لٹا ہوا اسیروں کا قافلہ تھا۔ اسے ظالم اپنی فتح کا اعلان سمجھ رہا تھا مگر وہ تو درحقیقت حسینؑ کی فتح کا اعلان تھا۔ نیزوں پر وہ سر تھے جو انکار بیعت پر قائم رہنے کے علم تھے جو دشمنوں کے ہاتھوں بھی سب سے بلند تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تماشا دیکھنے والو چاہے تم تماشائی دیکھتے رہے مگر تم گواہ رہنا کہ ہم نے بیعت نہیں کی اور پیغمبر اسلام کے وارث اور اُن کے پورے خاندان نے یزید کو جائز خلیفہ نہیں مانا۔

١

اپنے عالم میں اخلاق کا خیال ہے۔

حالانکہ خیام حسینؑ میں سب حسن سے ہر حیثیت سے چھوٹے ہیں مگر امام ہر خیمہ پر آکر سلام کرتے ہیں اور نام بنام کسی طبقہ کو نظر انداز نہیں کرتے یہاں تک کہ گھر کی کنیز فضہ تک کو یاد فرماتے ہیں۔ کیا یہ عام انسانی طاقت فہم سے بالاتر چیز نہیں ہے؟

اور ملاحظہ ہو۔ میدان جہاد سے جس نے آواز دی حسینؑ وقت آخر اس کے سرہانے پہنچے۔ اس میں امام پر تعب و مشقت کتنا بڑھ گیا۔ خیمہ گاہ سے مقتل کا فاصلہ اور اس تمازت آفتاب اور تین دن کی پیاس میں اتنی دفعہ جانا اور اتنی دفعہ آنا مگر کیا ممکن تھا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے اس دستور میں کوئی فرق آنے دیتے۔

بلکہ جس میں احساس کمتری کا امکان تھا اس کے لیے خصوصیت بڑھا دی۔ جون غلام ابوذر کے سرہانے فقط گئے ہی نہیں بلکہ اس کے رخسارہ پر رخسارہ رکھا اور بارگاہ الٰہی میں اس کے لیے دعائیں فرمائیں۔

یقیناً یہ وہ اخلاقی اصول کی انجام دہی تھی جو ان حالات میں حسینؑ کے سوا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

عراق کے راستے میں امام حسینؑ نے دشمنوں کی فوج کو پانی پلایا تھا۔ یہی اخلاق کا عمل کیا کم تھا مگر اس سے بڑی معراج اخلاق اس میں نظر آتی ہے کہ کربلا میں جب انہی دشمنوں نے پانی بند کر دیا اور چھوٹے بچے تک پیاس کی شدت سے بیتاب تھے اور پانی کے لیے تڑپ رہے تھے تو امام نے ہر طرح پانی مانگا مگر کبھی اپنا وہ سلوک یاد نہیں دلایا کہ میں نے پانی پلایا تھا۔ اس لیے کہ احسان کر کے اسے یاد دلانا بلند ظرفی کا مقتضا نہیں ہے۔

ایسے ہی کتنے درس اخلاق ہیں جو کارنامۂ حسینی کی تفصیلات میں مضمر ہیں جن کی یاد قائم رکھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا انسان کو حقیقی انسانیت سے روشناس بنانے کا ضامن ہے۔

استقامت علی الحق کا معیاری نمونہ

۵ر جون ۵۵ء کو سیتا پور کے حسین ڈے میں تقریر

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

"وہ جن کا قول یہ ہے کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور پھر وہ اس پر برقرار بھی رہتے ہیں نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ انھیں رنج ہوگا۔

"قول یہ ہے" اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لفظیں زبان پر ہیں بلکہ مقولہ سے مراد ہے ان کا اصول حیات جو ان کے لوح دل پر نقش ہے۔

اکثر جگہ قول کا استعمال جو قرآن میں ہے وہ اسی معنی سے ہے جیسے قل ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ یہ کوئی ورد نہیں ہے جس کے زبان سے دہرانے کا حکم ہو بلکہ یہ ایک حقیقی مسلم کا نصب العین ہے جسے پیش کیا جا رہا ہے اسی طرح قل ھو اللہ احد اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ الفاظ تمھاری زبان سے ادا ہونا چاہئیں بلکہ تمھارے پیش نظر ہمیشہ یہ رہنا چاہیے۔ تمھارا عقیدہ یہ چاہیے تمھاری زندگی سراپا اس حقیقت کا اعلان ہونا چاہیے۔

ان کا قول کیا ہے؟ یہ کہ ہمارا مالک اللہ ہے۔ اللہ وہ بلند و برتر ذات جس سے بزرگ و برتر کوئی دوسرا التصور ہونا ممکن نہیں اور وہ ذات جو نیکی ہی کو پسند کرتی ہے اور بدی سے مخالفت کرتی ہے جب یہ ذہن میں رہے گا کہ ہمارا مالک وہ ہے تو انسان سچائی اور اچھائی کے راستے سے منحرف نہ ہوگا کیوں کہ انسان از روئے فطرت نیکی اور سچائی کو پسند کرتا ہے لیکن طمع اور خوف کے جذبات اس کو برائیوں کی طرف لے جاتے ہیں اگر اللہ کے مالک ہونے کا تصور رہا تو کوئی طمع اور خوف اس کو متاثر نہیں بنا سکتا۔

پھر یہ کہ انسان جب اپنے کو مستقل وجود سمجھتا ہے تب ہی خطروں کا خیال کرتا ہے مگر جب اپنے نفس کا مالک اللہ کو سمجھ لیا تو وہ خطروں سے بے نیاز ہو جائے گا وہ مالک ہے لہٰذا اسے باقی رکھنا ہے تو باقی رکھے اور اٹھا لینا ہے تو اٹھالے۔ یہی تصور راہ حق میں بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار کر دینے کا ضامن ہے۔

حضرت امام حسین کے سامنے یہ تصور بدرجہ اتم تھا پھر یہی احساس کہ ہمارا مالک اللہ ہے یزید کی بیعت سے انکار کا ذمہ دار تھا۔ جب اللہ کو اپنا مالک مان لیا تو اب کسی یزید کی بیعت کہاں ممکن ہے۔

انھیں اللہ کے مالک ہونے کا تصور کوئی حادث تصور نہ تھا وہ تو ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا اس کے بعد یزید کی بیعت ان کے لیے ممکن ہی نہ تھی۔

اس تصور راسخ کے ناقابل تبدیل تقاضوں پر سختی کے ساتھ قائم و برقرار رہنا ہی وہ "استقامت" ہے جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا۔

اب اسی استقامت کو چاہے دنیا ضد سے تعبیر کرے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ امام حسین نے مشیروں کا کہنا نہیں مانا۔ ضد سے کام لیا وہ بڑے ضدی تھے میں کہتا ہوں کہ اگر اس کا نام ضد ہے تو کون نبی تھا جس نے ضد سے کام نہیں لیا۔ جناب ابراہیم بتوں کی مخالفت سے باز آجاتے تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے۔ جناب موسیٰ فرعون کی ہدایت ترک کر دیتے تو مصر سے کیوں نکلنا پڑتا۔ یحییٰ نے بادشاہ وقت کو اس کی خواہش کے مطابق مسئلہ بتا دیا ہوتا تو ان کا سر کیوں قلم کیا جاتا بلکہ ضد اگر اسی کا نام ہے تو سب سے پہلے اس فہرست میں خود حضرت رب العزت کا تذکرہ آنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو نبی آتا تھا اس کی تکذیب کی جاتی تھی اسے اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں یا اسے قتل کر دیا جاتا تھا اور وہ تھا کہ نبی کے بعد نبی بھیجے ہی چلا جاتا رہا۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ جو باطل پر قیام ہو وہ مذموم ہوتا ہے اور جو حق پر قیام ہو وہ ہوتا ہے صبر و ثبات اور استقلال اور اسی کو قرآن مجید میں کہا گیا ہے "استقامت"۔

حق پر استقامت کا نتیجہ کیا ہے؟ فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

"تمھیں یہ احساس ہے کہ ہم را مالک اقتدار ہیں اور وہ اس پر قائم و برقرار رہتے ہیں انھیں نہ قبل وقوع واقعہ خطرہ ہوگا اور نہ بعد وقوع واقعہ افسوس ہوگا"

اب اس معیار پر واقعات کی روشنی میں دیکھیے کہ واقعہ کربلا سے پہلے خوف کسے تھا؟ حسینؑ کو یا ان کے مخالفین کو، اور بعد وقوع افسوس کسے ہوا؟ حسینؑ کو یا یزید کو؟

ظاہری اسباب کی بنا پر تو سلطنت وقت کو خوف کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے کہ تمام عالم اسلامی بیعت کر چکا تھا۔ معدودے چند تھے جنھوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ ان میں بھی بعض کے متعلق معلوم تھا کہ وہ کمزور قسم کے اشخاص ہیں۔ مضبوط ارادے کے مالک جو تھے وہ ایک حضرت امام حسینؑ تھے۔ پھر بھی یزید مبتلائے خوف تھا۔

حضرت امام حسینؑ سے طلب بیعت خود خوف کا نتیجہ تھا وہ جانتا تھا کہ سب سہی مگر حق میری طرف نہیں۔ یہی خلش کہ حق میری طرف نہیں محرک ہوئی کہ علمبردار حق سے بیعت لی جائے۔ یزید جانتا تھا کہ حسینؑ کو امت اسلامیہ پر حکومت کا حق ہے اور حقیقی سردار مسلمانوں کے حسینؑ ہیں یہی وجہ رقابت ہو سکتی تھی ورنہ بادشاہ کو فقیر سے کیا، صاحب تاج و تخت، مالک جاہ و حشم کو ایک زاہد گوشہ نشین سے رقابت کے معنی ہی کیا ہیں۔

پھر اگر یزید کی حکومت بنام دنیا ہوتی تو بھی یہ کد نہ ہوتی مگر وہ حکومت تو بنام دین تھی بنام جانشینی رسول تھی اور حسینؑ محافظ دین اسلام اور حقیقی جانشین رسولؐ تھے بس یہ وجہ عناد و مخالفت تھی اور یہ خوف تھا کہ نہ جانے کب دنیا اصل مرکز کی طرف کھنچ جائے۔ اس لیے حصول بیعت کی فکر تھی

مگر حسینؑ ــــ وہ مطمئن تھے۔ انھیں کوئی خوف نہ تھا کیونکہ وہ اللہ کو اپنا رب سمجھتے تھے۔ جب انھوں نے کہا کہ میں بیعت نہیں کروں گا تو چاہے دنیا نہ سمجھتی ہو مگر وہ جانتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ انھوں نے سب کچھ سمجھ کر کہا تھا کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ اس کے مفہوم میں یہ سب داخل تھا کہ بیعت نہیں کروں گا چاہے وطن چھوڑنا پڑے بیعت نہیں کروں گا چاہے سب انصار قتل ہو جائیں بیعت نہیں کروں گا چاہے برابر کا بھائی جوان بیٹا، بھتیجے بھانجے سب کام آ جائیں۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے اس وقت انکار کیا تھا جب تمام انصار و اعزا موجود تھے اور حسینؑ اس وقت بھی انکار پر قائم رہے جب کوئی پاس نہ رہا بلکہ اس وقت بھی جب سر قلم کر دیا گیا۔ یزید کا طلب بیعت تھا خوف کا نتیجہ اور امام حسینؑ کا انکار بیعت تھا بے خوفی کا نتیجہ۔

اس کے بعد یہ کہ یزید اور ابن زیاد کے ذرائع خبر رسانی یہ بتا رہے تھے کہ امام حسینؑ کے ساتھ کتنے آدمی ہیں تو پھر ذرا غور کیجیے کہ عام نظام اسباب کے مطابق سو ڈیڑھ سو افراد کے لیے کتنی فوج درکار ہے؟ ظاہر ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانچ سو اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار۔ پھر کربلا میں یہ تیس ہزار فوج کیوں اکٹھا کی گئی؟ یہ صرف خوف کا اثر ہو سکتا ہے جو بے اطمینانی ضمیر کا نتیجہ ہے حقانیت کی بے پناہ طاقت سے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جو فوج بھیجی جائے اسی میں سے بہت افراد کہیں حسینؑ کی طرف نہ چلے جائیں۔ اس خطرہ کی صحت حرؑ کی شکل میں ظاہر ہو گئی۔

لشکر کی تعداد کا بڑھانا خود ان میں سے ہر فرد کے ضمیر پر دباؤ ڈالنا تھا۔ اب کسی ایک کا اس فوج سے الگ ہونا تیس ہزار کے متحدہ آہنگ سے جنگ کرنا تھا۔ نفسیاتی طور پر ساتھیوں کی کثرت ہر فرد کے لیے بہت شدید زنجیر ہوتی ہے اس کے لیے ایسا ہی قوی ارادہ کا مالک تیار ہو سکتا تھا جو تیس ہزار کے متحدہ راستے کے خلاف اپنا جادہ بنا سکے۔

یہ تو ادھر کے خوف کا عالم تھا اور امام کی بے خوفی دیکھیے کہ جو جماعت قلیل ساتھ تھی اسے بھی رخصت کر رہے تھے۔ ایک فقرہ تو امام نے ایسا کہہ دیا تھا کہ شاید اصحاب بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے کہ کہیں واقعی امام ہمیں رخصت کر دینا ہی تو مناسب نہیں سمجھتے۔ وہ فقرہ یہ تھا کہ "میرے عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ" حالانکہ اس ارشاد میں اس کا اظہار مضمر تھا کہ یہ ساتھ چھوڑنے کی تحریک بے اعتمادی یا بے گانگی کے احساس کی بنا پر نہیں ہے اور بے اعتمادی کا تصور یوں بھی ختم فرمایا کہ آپ نے وفاداری کی سند پہلے ہی دے دی تھی کہ انی لا اعلم اصحابا اوفی من اصحابی ولا اہل بیت ابر و لا اوصل من اہل بیتی ــــ یہ بے خوفی کا اعلان نہیں تو اور کیا ہے کہ امام اصحاب کی زندگیاں ان کو واپس کیے دیتے ہیں اور وہ انھیں امام کے قدموں پر ڈالے دیتے ہیں آپ ان سے بے نیاز اور وہ اپنی زندگیوں سے بے نیاز۔

زندۂ جاوید کا ماتم

(احاطہ ممتاز محل ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۵۲ء مطابق ۱۲؍ صفر ۱۳۷۲ھ کی تقریر)

اقبال سہیل کا اعتراض مشہور ہے کہ

روئیں وہ جو قائل ہوں ممات شہدا کے
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اس کا تجزیہ کیا جائے تو کیا ہوگا؟ غور کیجیے کہ یہ ممات اور حیات جو شہدار کے لیے مورد نفی و اثبات ہوسکتی ہے کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ شہداء کی زندگی وہ مادی زندگی نہیں ہے جس لحاظ سے قبل شہادت انھیں زندہ کہا جاتا تھا اور جو ظاہری طور پر اس دار دنیا سے متعلق ہوتی ہے اس لیے کہ شرع اسلامی میں شہداء کی بھی میراث تقسیم ہوتی ہے، ان کے اطفال حکم یتیم میں اور ان کے ازواج حکم بیوہ میں ہوتے ہیں۔ اگر ان کے لیے موت کا تصور کسی حیثیت سے کیا نہ جائے تو ان کے متروکہ کی تقسیم ان کی اولاد کی یتیمی اور ان کے ازواج کی بیوگی بالکل بے بنیاد ہوگی۔

ہمارے مذہبی نقطہ نظر سے شہید اگر امام ہے تو اس کے بعد دوسرا امام برسر اقتدار آجاتا ہے حالانکہ حیات ظاہری میں ایک امام کے ہوتے ہوئے دوسرا امام حامل منصب نہیں ہوتا بیوہ کے لیے عقد ثانی کی اجازت جس طرح شوہر کی موت کے بعد ہے اسی طرح شہادت کے بعد حالانکہ زندگی میں یہ ممکن نہیں۔ احکام اموات میں صرف غسل و کفن شہید کے لیے نہیں ہے۔ نماز میت اور دفن لازم ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا بھی تعلق موت کے ساتھ ہے زندگی کے ساتھ نہیں۔

جبکہ شہدار کی زندگی اس نوعیت کی نہیں ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ زندگی جسے شہدار کے لیے ثابت کیا گیا ہے۔ ارتقائے روحانیت کا کوئی خاص درجہ ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انبیائے الٰہی میں سے کسی کے لیے بھی اگرچہ اصطلاحی طور پر شہید نہ ہو موت نہیں ہے بلکہ جاودانی زندگی ہے جس کے مراتب باعتبار مراتب تقرب الٰہی مختلف ہوں گے۔ پیغمبر خدا کی متفقہ حدیث ہے من مات علیٰ حب آل محمد مات شہیدا۔

بے شک فقہی حیثیت سے احکام شہیدا یعنی غسل و کفن کا ساقط ہونا یہ معرکہ جنگ میں شہادت پانے والے کے ساتھ مخصوص ہیں مگر مرتبۂ شہادت کا حصول بقدر ایمان ہر مومن کے لیے ہے۔ پھر جب ہر مومن بقدر ایمان مردہ نہیں تو انبیاء و مرسلین کا کیا تذکرہ چنانچہ سوائے نجدی عقیدہ والے وہابیوں کے اور تمام مسلمان حیات پیغمبر خدا کے قائل ہیں۔ خود حضرت کی حدیث ہے کہ "میری وفات کے بعد مجھ پر اسی طرح سلام کرنا جیسے زندگی میں کیوں کہ سلام تمھارا دونوں حالتوں میں مجھے یکساں طور پر پہونچے گا"

بعض علمائے اسلام نے اسی لیے روضۂ رسولؐ کے پاس بلند آواز سے بات کرنے کو منع کیا اور کہا قرآن مجید میں ہے لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا لہ بالقول اس حکم کی تعمیل جس طرح اس وقت تھی اسی طرح اب ہونا چاہیے اس لیے کہ رسولؐ زندہ ہیں اور ہماری آواز سنتے ہیں۔

اب مذکورہ بالا شعر کے مضمون پر غور کیجیے۔ وہ کہتا ہے کہ جو زندہ جاوید ہو اس کا ماتم نہیں کرنا چاہیے اور یہ پہلے بیان ہوچکا کہ زندگی جاوید حسن عمل سے وابستہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماتم کے قابل ان کی موت ہے جو انتہائی بد اعمال ہوں اور حسن اعمال رکھنے والوں کا ماتم نہیں کرنا چاہیے۔

اب جبکہ اس شعر سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے تو آئیے اسے قرآن کے سامنے پیش کریں کیوں کہ کہنے والا بظاہر مسلمان ہے اور اس نے جو کہا ہے وہ صرف شاعرانہ انداز میں نہیں ہے جسے تبسم زیر لب کے ساتھ صرف اس کے شاعرانہ کیف کو محسوس کر کے نظر انداز

اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں کوئی بچہ بھی خائف نہیں اور ان میں سے کسی کے قدم میں ذرہ برابر تزلزل نہیں آیا۔ مگر وہ تیس ہزار کا لشکر۔ الغرض روز عاشورا کتنی بار میدان چھوڑ دیا۔

اب لیجیے حزن کو۔ حزن سے مراد کسی مصیبت سے متاثر ہونا یا تکلیف کا احساس کرنا نہیں ہے بلکہ یہ افسوس ہونا ہے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا جس کا نتیجہ اس صورت میں رونما ہوا۔

واقعہ کربلا کے بعد اُدھر شادیانے بج رہے ہیں۔ خوشی سے عیدیں منائی جا رہی ہیں۔ مگر حقیقت میں افسوس ہے۔ افسوس احساس شکست سے۔ یزید کا یہ کہنا کہ خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے اس نے کیوں ایسا کیا۔ یہی افسوس کا مظاہرہ ہے۔ اسی افسوس کو آج تک یزید کی برأت ثابت کرنے کے لیے اس کے ہوا خواہوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ برأت کا دعویٰ غلط ہے۔

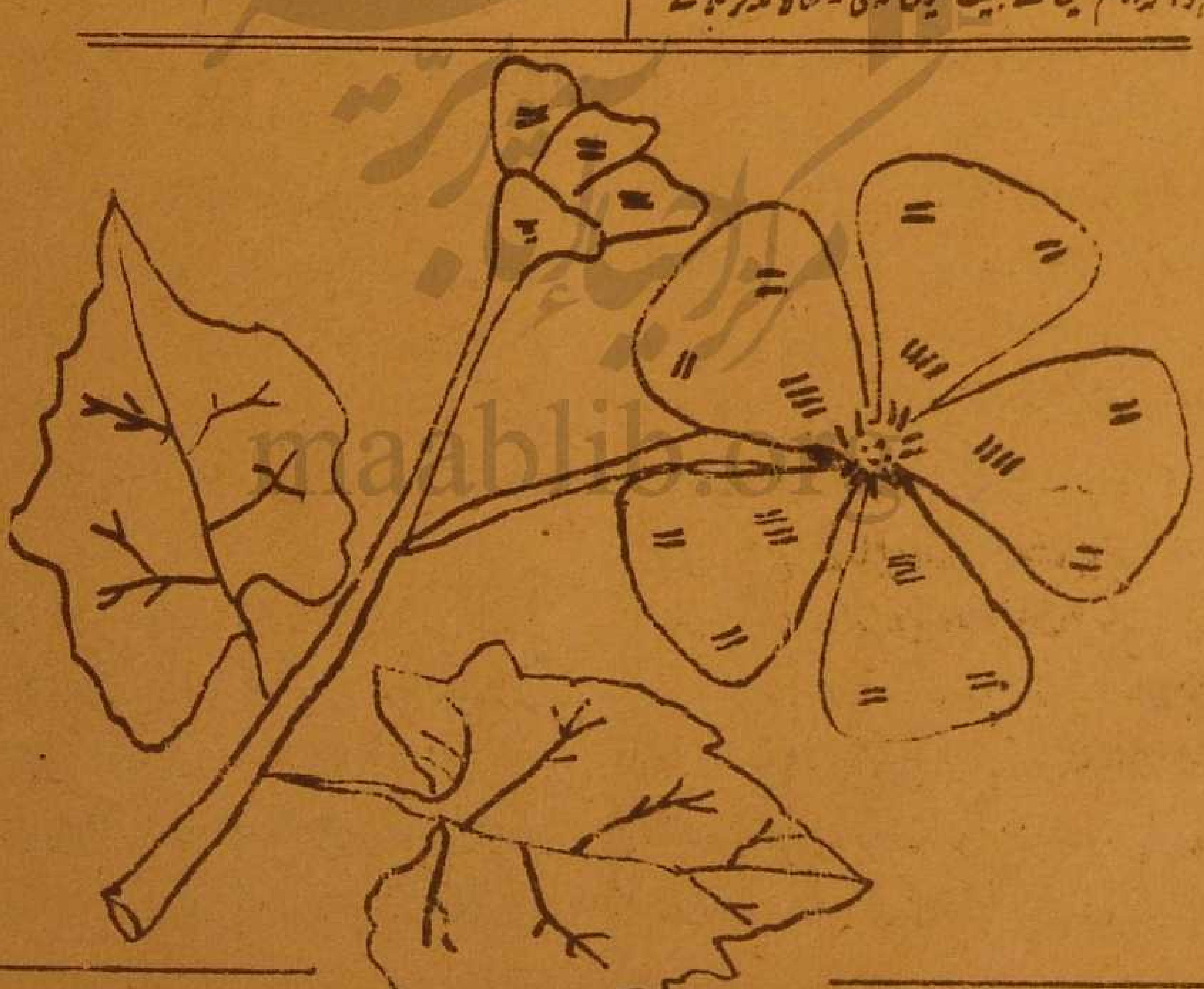
بدیہی ثبوت اس کا کہ یزید ہی واقعات کربلا کا ذمہ دار تھا یہ ہے کہ اگر ابن زیاد نے اتنا بڑا اقدام بطور خود کیا تھا تو واقعہ کربلا کے بعد اُسے حکومت سے معزول کیوں نہ کیا گیا۔ حالانکہ اہلبیت کے ساتھ ذرا بھی مراعات کرنے والا ہر حاکم معزول کیا گیا مگر یہ شکست کے احساس کے بعد افسوس تھا جو ہر باطل پرست کو کبھی نہ کبھی ہونا لازمی ہے۔

مگر امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں میں سے کسی اور کا کیا ذکر کسی بچہ تک کو یہ افسوس نہیں ہوا کہ امام حسینؑ نے بیعت کیوں نہ کی۔ حالانکہ کربلا کے مصائب تدریجی طور پر وقوع میں آئے۔ اگر کسی وقت افسوس ہوا ہوتا تو طرز عمل میں تبدیلی ہو جاتی اور مصائب سے بچنے کی تدبیر اختیار کی جاتی۔

کسے افسوس ہوا؟ اس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہوگا کہ یہ دیکھیے کہ یزید اور اس کے جانشینوں نے مطالبۂ بیعت سے دستبرداری کی یا حضرت امام حسینؑ کے جانشینوں نے انکار بیعت سے؟

یہ واقعہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے بعد یزید نے آپ کے پس ماندگان میں سے کسی سے بھی بیعت طلب نہیں کی اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے مطالبہ سے ہٹ گیا اور ان حضرات میں سے کسی نے اپنے وقت کے حاکم کی بیعت نہیں کی۔

پھر آخر میں ایک اور ثبوت اس کا ملاحظہ ہو کہ جسے افسوس ہوتا ہے وہ واقعہ کو چھپانا چاہتا ہے اور جو خوش ہوتا ہے وہ اس کا اظہار کرتا ہے۔ اب آج تک دیکھ لیجیے کہ یزیدی جماعت کے افراد واقعۂ کربلا کے اظہار کو ناپسند کرتے بلکہ ہر طرح اُس کے چھپانے کے درپے ہوتے ہیں اور حسینی جماعت کے افراد اُس کی یادگاریں قائم کرتے اور اس کے ذکر کو بہر صورت زندہ رکھنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ حسینی جماعت کو کارنامۂ حسینی پر بالیدگی اور فخر ہے اور وہ فخر اس کا ہے کہ حسینی قربانی نے حق و باطل کا امتیاز ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا جو آپ کا حقیقی نصب العین تھا۔



اس کے بعد جب حضرت مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ اور مسجد کی طرف جاتے ہوئے سنا کہ انصار کے گھروں میں رونے کی صدائیں بلند ہیں۔ ان عزیزوں کے غم میں جو جنگ احد میں شہید ہوئے تھے۔ تو حضرت نے فرمایا۔ اما حمزہ فلا بواکی لہ "افسوس میرے چچا حمزہ پہ رونے والیاں کوئی نہیں"۔ چونکہ جناب صفیہ اپنے گھر میں اکیلی تھیں۔ مثل مشہور ہے۔ اکیلا آدمی نہ روتا بھلا نہ ہنستا۔ وہ تھوڑی دیر بعد کر چپ ہو گئی تھیں۔ حضرت نے یہ کلام حسرت آمیز فرمایا۔ تو اس کی اطلاع خواتین انصار تک پہونچ گئی۔ وہ اسے سن کر خانہ جناب حمزہ میں آگئیں۔ اور حمزہ کا ماتم برپا ہوگیا۔ یہ زندہ جاوید کا ماتم کس نے برپا کرایا۔ رسول اللہؐ نے۔ اب کسی مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ اس ماتم کو اچھا سمجھے یا برا؟

جناب جعفر طیار بھی شہید ہوئے۔ موتہ میں ان کے دونوں ہاتھ قلم ہوئے۔ پیغمبر خدا نے منبر پر اپنے خطبہ میں ان کی خبر شہادت مسلمانوں کو سنائی۔ جو خانہ سیدہ عالم میں بھی پہونچ گئی۔ جب حضرت تشریف لائے تو دیکھا۔ فاطمہ زہرا روتی ہیں۔ رسول نے انھیں بھی نہیں فرمایا۔ کہ جعفر زندہ جاوید ہیں۔ روتی کیوں ہو۔ بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ علیٰ مثل جعفر فلتبک البواکی جعفر ایسے آدمی پر رونے والیوں کو رونا ہی چاہئے:۔

دیکھئے۔ جناب رسول نے ایک عام اصول کا اعلان کر دیا۔ اگر کہا ہوتا کہ جعفر پر ضرور رونا چاہئے۔ تو وہ ایک حکم جزوی ہوتا۔ اسے صرف بحیثیت نظیر پیش کیا جا سکتا تھا۔ مگر علیٰ مثل جعفر۔ جعفر ایسے آدمی پر یہ تو ایک کلی اصول ہے۔ ایک اصول معیار ہے۔ اب جعفر ایسے کی تطبیق کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ ایسے صاحب اوصاف شخص پر جب بھی ثابت ہوگا کہ حسن اعمال کا نتیجہ ہے استحقاق گریہ جو قرآن کی آیت کے بالکل مطابق ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں۔ کہ جس کو اس طرح موت آئی ہو۔ جیسے جعفر کو آئی۔ یعنی راہ خدا میں شہید ہوا ہو۔ تب تو صاف صاف یہ اس اصول کا اعلان ہے۔ کہ زندہ جاوید ہی کا ماتم کیا جانا چاہئے۔ اب کس مسلمان کے لئے جائز ہوگا۔ کہ وہ کہے ہم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ وہ جب یہ کہتا ہے۔ تو پیغمبر خدا کے ارشاد سے بغاوت کا اعلان کرتا ہے۔ جو اگر سمجھ بوجھ کر ہو تو یقیناً دائرہ اسلام سے خارج کرنے کے لئے کافی ہے۔

اپنے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں اگر ہم ایک شعر کی شکل میں اقبال سہیل کا جواب دینا چاہیں۔ تو یوں کہہ سکتے ہیں۔

کیا روؤگے ان کو جو ہلاک ابدی ہیں۔
کیوں زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔

(یعنی) قرآن اور حدیث تو یہی کہہ رہے ہیں کہ زندہ جاوید کا ماتم کرنا چاہئے۔

اب اگر کچھ لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ تو وہ ان کا ماتم کریں جنھیں ہلاکت ابدی نصیب ہوئی ہے۔ مگر ان کا ضمیر بھی شاید اس کو پسند نہ کرے گا۔

کہا جاتا ہے کہ رونا بزدلی کی نشانی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی خطرناک معرکہ میں موجود رہ کر خطرہ کے احساس سے رونا بزدلی قرار پا سکتا ہے۔ مگر کسی خطرناک جہاد میں عدم شرکت پر رونا عین بہادری و شجاعت ہے۔ یاد رکھئے کہ کربلا کے مجاہدین زخم کھاتے۔ اور اپنا خون بہاتے ہوئے گریہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہاں تو بریر اور عبدالرحمٰن آپس میں مذاق کرتے نظر آتے ہیں۔ وہاں تو عباسؑ و علی اکبرؑ کا کیا ذکر شیرخوار علی اصغرؑ تک مسکراتے ہوئے شہید ہوئے ہیں۔

ہاں عباسؑ نہیں روئے۔ اور علی اکبرؑ نہیں روئے کیونکہ انھیں خون افشانی کا موقع مل گیا۔ مگر زین العابدینؑ عمر بھر روئے کیونکہ حکمت ربانی نے ان کو اس قربانی میں شہید ہو کر شرکت سے مجبور رکھا دیا تھا۔

ہماری بھی اگر قسمت یاوری کرتی کہ اس قربانی میں عملی حیثیت سے شریک ہوتے تو پھر خون افشانی کرتے۔ اشک افشانی نہ کرتے۔ یہ اشک افشانی تو اس پر ہے کہ اس سعادت کو حاصل نہ کر سکے۔ اب اگر اس تصور کے ساتھ یہ آنسو بہائے جا رہے ہیں۔ تو ان سے ہمت میں کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہمیں آرزو رہے۔ اور بے چینی سے انتظار۔ کہ اب جو نصرت دین کا عملی موقع ہمیں دستیاب ہو سکے۔ اس میں اپنی ممکن اور با عمل قربانی سے دریغ نہ کریں:۔

کر دیا جائے۔ بلکہ اس نے منطقی انداز میں صغریٰ اور کبریٰ ترتیب دے کر کے ایک نتیجہ نکالا ہے۔ جس سے ایک پوری قوم کے طرز عمل پر اعتراض مقصود ہے۔

آیت قرآن مجید کی سامنے ہے۔ اس موقع کی جب فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا۔ تو ارشاد ہوا ہے:۔

فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین۔

۔نہ ان پر آسمان رویا۔ اور نہ زمین نے گریہ کیا۔ اور نہ انہیں اللہ کی طرف سے مہلت دی گئی۔، ظاہر ہے کہ یہ کنایہ ہے۔ جس سے ان کی بداعمالی کا اظہار مقصود ہے۔ کنایہ میں کسی حقیقت کے آثار و لوازم کا تذکرہ کر کے ذہن کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ اس کی ضد کے لوازم کو بیان کیا جائے، مثلاً یہ بتانا ہو کہ صبح ہو گئی۔ تو یہ کہیں گے کہ روشنی ہو گئی یہ نہیں کہیں گے کہ اندھیرا ہو گیا۔ جو کہ شام کے لوازم میں سے ہے۔ رات کی شدت دکھانا ہو تو کہیں گے۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دیتا۔ جو ظلمت کے اظہار میں مبالغہ ہے۔ اب دیکھیے شاعر کا نظریہ یہ تھا۔ کہ رونا اسے نہیں چاہیے۔ جو خوش اعمال ہو۔ بلکہ اسے رویا جائے۔ جو بداعمال ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بداعمالی کا نتیجہ ہے استحقاق گریہ۔ خوش اعمالی کا نتیجہ نہیں ہے۔ مگر قرآن بداعمالی کے اظہار میں کہہ رہا ہے۔

فما بکت علیھم السماء والارض۔

ان پر آسمان و زمین نے گریہ نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے بداعمالی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان پر نہ رویا جائے۔ اس کے بالمقابل جو حسن عمل رکھنے والے ہوں۔ وہ مستحق گریہ ہونگے۔ اب جتنا بلند مرتبہ کا انسان ہو۔ جتنا مرکز فیوض برکات زیادہ ہو۔ وہ دنیا سے اٹھے تو اس کا اٹھنا گریہ و ماتم کا باعث ہو گا۔ یوں تو عموماً آسمان و زمین کی طرف گریہ کی نسبت بطور مجاز عقلی ہو سکتی ہے۔ جیسے واسئل القریۃ یعنی اہل القریہ۔ ہمارے روزمرہ میں پورا شہر گواہ ہے۔ یعنی اہل شہر اسی طرح آسمان و زمین روتے ہیں۔ یعنی اہل آسمان و زمین مگر اٹھنے والے کی پیش خدا شخصیت کے لحاظ سے کبھی یہ مجاز حقیقت بھی بن سکتا ہے۔ یعنی مرنے والا جو دنیا سے اٹھا تو واقعی وہ زمین روئی۔ اور آسمان نے گریہ کیا۔ پھر اگر زندہ جاوید کو آسمان و زمین گریہ کر سکتے ہیں۔ جن کا کوئی فعل ارادہ باری کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تو اس کا انسان بھی ماتم کریں۔ تو یہ مرضی الٰہی کے مطابق ہو گا۔

پھر اب یہ دیکھیے کہ شہدا کے زندہ جاوید ہونے کا علم ہم کو کس کے ذریعہ سے ہوا۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام ؐ کے ذریعہ سے پھر اس زندگی کے تقاضوں سے ہم زیادہ واقف ہوں گے۔ یا پیغمبر اسلام ؐ؟ اب تاریخ اسلام پر نظر ڈالیے۔ بتائیے جناب حمزہ ابن عبدالمطلب شہید تھے۔ یا نہیں؟۔ یقیناً شہید اور ایسے شہید کہ پیغمبر خدا ؐ نے سید الشہداء کا لقب دیا۔ تو پھر زندہ جاوید ہونے میں کیا شبہ۔ مگر حمزہ کی شہادت کے بعد کیا ہوا۔ غم کیا گیا۔ یا خوشی۔ آنسو بہائے گئے۔ یا قہقہے لگائے گئے۔ یاد رکھیے کہ سنت وہ ہے جس کی نظیر عمل رسول میں ہو۔ اور بدعت وہ ہے کہ جو عمل رسول کے خلاف ہو۔ اگر حمزہ کی شہادت پر رسول اللہ ہنسے ہوتے تو رونا بدعت ہوتا۔ لیکن اگر رسولؐ روئے ہیں۔ تو پھر کسی شہید پر رونا بدعت نہ ہو گا خوشیاں کرنا ہی بدعت قرار پائے گا۔

تاریخ گواہ ہے۔ کہ جب جناب حمزہ کی شہادت ہو گئی ہے۔ اور صفیہ خواہر حمزہ بھائی کی خبر سن کر میدان احد کی طرف روانہ ہوئیں اور رسول کو اس کی اطلاع ہوئی۔ کہ صفیہ آ رہی ہیں۔ تو پہلے آپ نے حضرت علی بن ابی طالب سے فرمایا کہ جلدی حمزہ کی لاش کو چھپائیں تاکہ بہن کی نظر بھائی کے جسد عریاں پر نہ پڑے۔ حضرت علی نے جا کر اپنی عبا لاش جناب حمزہ پر ڈالی مگر جناب حمزہ قد آور تھے۔ پاؤں کھلے رہ گئے۔ تو آپ نے گھاس صحرا کی جمع کر کے پیروں کو مخفی کیا۔ اتنی دیر میں صفیہ پہنچ گئیں۔ اور لاش برادر پر گریہ شروع کیا اس موقع پر یہ نہیں ہوا کہ رسول صفیہ کو منع فرماتے اور ارشاد کرتے کہ تمہارے بھائی زندہ جاوید ہیں۔ زندۂ جاوید کا ماتم کیوں کرتی ہو۔ بجائے اس فرمانے کے خود آپ صفیہ کے ساتھ رونے میں شریک ہو گئے۔ اور تاریخ میں یہ فقرہ ہے کہ:۔

یبکی کلما بکت صفیۃ و ینشج کلما نشجت صفیۃ

نشج کے معنی عربی میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جانے کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ جتنا جتنا صفیہ روتی تھیں۔ اتنا اتنا رسول گریہ فرماتے تھے۔ یہاں تک جب صفیہ کی روتے روتے ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ تو خود پیغمبر کی بھی یہی حالت تھی۔ اب بتائیے زندہ جاوید کا ماتم ہوتا ہے۔ یا نہیں۔